جلد ۲۳

ہمایوں

نمبر ۱

ایڈیٹر: بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں بی اے

تصاویر

فہرستِ مضامین جنوری سنہ ۱۹۳۳ء

طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ مدیر "ہمایوں"

کے

ادبی مضامین کا دلکش مجموعہ

عنقریب شائع ہو رہا ہے طلسمِ زندگی میاں صاحب کی پندرہ سال کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں تقریباً سو چھوٹے مضمون اور پونے دو سو چھوٹے چھوٹے شہ پارے ہیں مناظر صدائے روح، آئینۂ دل، جد و جہد، سرگوشیاں، خیالاتِ پریشاں، چھ مختلف باب ہیں جن میں مضامین تقسیم کئے گئے ہیں طلسمِ زندگی، حسنِ فطرت، اخلاق، تصوف، نفسیات اور محبت کے پاکیزہ جذبات کا ایک بوقلموں نگار خانہ ہے جس میں زندگی کے صحیح اور فلسفیانہ مطالعہ کے بدیع المثال اور دلاویز مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب کا ایک حصہ لطیف مزاحیہ مضامین کے لئے بھی وقف کیا گیا ہے جو گویا ملح فی الطعام کا کام دیتا ہے

اس مجموعے میں "ہمایوں" کے مطبوعہ مضامین کے علاوہ جدید مضامین بھی شامل ہیں بلکہ مطبوعہ مضامین بھی تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ کے بعد بالکل ایک نئے قالب میں ڈھل گئے ہیں+

بخلافِ اعلانِ سابق طلسمِ زندگی میں اکیس ۲۱ بلاک ہوں گے جن میں سے چودہ سہ رنگ ہیں یہ تصویریں بھی ایسی ہیں جو اپنی جگہ استادانِ فن کے بہترین مصورانہ کمالات کا نمونہ سمجھی گئی ہیں+

کتابت پنجاب کے ایک بہترین خوشنویس کے سپرد کی گئی ہے۔ طباعت اعلیٰ درجے کے اہتمام سے ہوگی۔ اس کے علاوہ کتاب کی آرائش کے لئے ماہرِ فن مصوروں کے مشورے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ غرضکہ "طلسمِ زندگی" کی معنوی صورت کی طرح ظاہری صورت کو بھی دلکش بنانے کے لئے تجارتی مصالح کو نظر انداز کرتے ہوئے بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا ہے+

حجم ۲۵۰ صفحات کے قریب ہوگا اور جلد بہت خوبصورت ہوگی۔ کاغذ دبیز ولایتی آرٹ پیپر ہوگا۔ سابق اعلان کے بعد کتاب کی آرائش میں اس قدر مزید اہتمام کیا گیا ہے کہ شاید اردو میں پہلے کسی ادبی کتاب کے لئے نہیں کیا گیا اس لئے طلسمِ زندگی کی قیمت تقریباً چار روپے ہوگی کہ یہی کتاب کی اصلی لاگت ہے+ ایک زیادہ قیمتی اڈیشن بھی شائع ہوگا جس کی جلد زیادہ نفیس ہوگی۔ اس کی قیمت فی الحال مقرر نہیں کی گئی+

یہ مجموعہ محدود تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے اڈیشن تک انتظار کی زحمت برداشت نہ کرنی پڑے تو فی الفور اپنی فرمائش دفتر "ہمایوں" میں بھیج دیجئے۔ جن حضرات کی فرمائشیں پہلے پہنچیں گی اُن کا حق فائق سمجھا جائے گا+

مینجر رسالہ "ہمایوں" ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

ترانۂ انجم

(۱)

کیسے نور سے جگمگا رہے ہیں تارے!
کیسے ساز پہ گنگنا رہے ہیں تارے!
دوری کی ہوتی ہے کون و مکاں میں آکر
اس لیے تلملا رہے ہیں تارے!

(۲)

جھلمل جھلمل جو کر رہے ہیں تارے
ظلمت سے نکل اُبھر رہے ہیں تارے
آمد آمد ہے شاہدِ معنی کی
اس واسطے بن سنور رہے ہیں تارے!

(۳)

ساز اپنا جو یوں بجا رہے ہیں تارے
لے حق کی کوئی سنا رہے ہیں تارے
کچھ اور ہے سارے گا ما پا دھا نی سے
کیا راگ ہے یہ جو گا رہے ہیں تارے

(۴)

مدت سے جو جھلملا رہے ہیں تارے
کیا جانے کہ کیا بتا رہے ہیں تارے
جس افسانے کی جان ہے ذاتِ خدا
ایسا افسانہ سنا رہے ہیں تارے

ا ب

جذباتِ ہمایوںؔ

کیوں مُشتِ خاک پر کوئی دِلِ داغدار ہو
مر کر بھی یہ ہوس کہ ہمارا مزار ہو!

ہو کر جو ذرّہ ذرّہ عناصر میں جائے رَل
یکساں ہے گردِ راہ بنے یا غُبار ہو

کیوں بیٹھے گرد آئینۂ دل پہ مثلِ خاک
کیوں ذرّہ ہائے خاک سے دِل سنگسار ہو

آواز کی طرح جو جہاں سے نکل گیا
پتھر کی طرح سینے پہ پھر کیوں وُہ بار ہو

انسان کو بے ثباتی پہ بھی اپنی ناز ہے
نقشِ قدم کی طرح یہ کیوں خاکسار ہو

گھوڑے اڑائے کیوں نہ وہ سرپٹ غرور کے
مر کر بھی جس کی رُوح ہوا پر سوار ہو

اُس بوالہوس کی موت پہ قربان جائیے
جو پھر دوبارہ جینے کا اُمیدوار ہو

لہروں میں ڈوب مرنے کا پھر کیوں کرے وہ شوق
اک بار غرق ہو کے جو دریا کے پار ہو

ہستی کا طوق تو ہی قیامت پسِ وفات
یارب کہیں یہ میرے گلے کا نہ ہار ہو

کملانا ہی تھا پھول کو۔ کر غم نہ عندلیب
کیوں داغِ دل سے سینہ ترا لالہ زار ہو

یکساں ہیں اہلِ دل کے لئے انبساط و غم
باغِ جہاں میں آئے خزاں یا بہار ہو!

دونوں کی مثل نقطۂ موہوم ہے بساط
عشرت میں خوش ہو غم میں کوئی بیقرار ہو

اے مادرِ شفیق! قضا کا لگے جو تیر
مرگِ جواں کے غم سے نہ تو دِلفگار ہو

اس صیدگاہ میں وُہی نکلے گا بچ کے صاف
جو صید سب سے پہلے اجل کا شکار ہو!

جاں بر نہ ہوگا کوئی بھی تیغِ فنا سے یاں
گو لاکھ سخت جاں ہو۔ توانا ہزار ہو!

بڑھ جائے غم کا سلسلہ کہسار کی طرح — طولانی گریہ زندگیٔ مستعار ہو

دنیا مقام رہنے کے قابل تو ہے۔ اگر — بیگانہ ہو نہ اپنا۔ عدو ہو نہ یار ہو

گل ہو نہ برگِ خشک ہو۔ بلبل ہو اور نہ زاغ — غم کی خزاں نہ ہو نہ خوشی کی بہار ہو

جوہر نہ ہو۔ نہ عرض۔ نہ کل ہو۔ نہ جزوِ کل — کون و مکان نہ ہو۔ نہ بہ لیل و نہار ہو

حد ہو نہ جسم کی۔ نہ کوئی روح کی ہو قید — مجبور ہو نہ کوئی۔ نہ بااختیار ہو!

آزاد بندِ شوق سے۔ آلائشوں سے پاک — بندہ بھی پھر تو بندۂ پروردگار ہو!

ہُو کا ہو عالم اور نہ کچھ ہو سوائے نور — اور تیر بن کے وہ مرے سینے کے پار ہو

اے ہستی! سختیاں تری کب تک سہے بشر؟ — کر دوں فنا تجھے جو مرا اختیار ہو!

کیوں غم کا ڈر۔ خوشی سے ہمایوں لگاؤ کیوں — ہاں یہ بھی نذرِ عالمِ ناپائدار ہو

رکھتی ہے اپنا لطف ہر اک طرز کیفیت — غم کا نشہ ہو یا کہ خوشی کا خمار ہو!

کیا لطفِ دیدِ گل ہو تو ہی کہہ دے ہمصفیر! — گلزار میں خزاں جو نہ بعدِ بہار ہو!

ہے رہنمائے خلق عمل جس کے نیک ہوں — کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دیندار ہو

مے خانہ ایسا چاہئے ہم مشربو! جہاں — کوئی نہ مست ہو نہ کوئی ہوشیار ہو!

پیمانۂ شکستہ کے ٹکڑے ہوں منتشر — مے ہو نہ ساقی ہو۔ نہ کوئی بادہ خوار ہو

پیرِ مغاں کے گرد ہو اک انجمن لگی، — عقلِ جواں بھی جان سے جس پر نثار ہو

روشن ہو نور سینے میں اک شمع کی طرح — قربان اُس پہ دل مرا پروانہ وار ہو

ہاں صاف صاف کہہ دو ہمایوں جو دل میں ہے — ہونٹوں میں بڑبڑانے یہ کیا بار بار ہو

دسمبر ۱۹۰۶ء

بزمِ ہمایوں

گزشتہ سال ہمایوں کی دسویں سالگرہ کے موقع پر بہت خوشیاں منائی گئی تھیں نہیں معلوم گیارھویں بارھویں تیرھویں سالگرہ میں کیا بات ہے کہ دل میں وہ جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ جب تک بیسویں سالگرہ نہ آلے گویا کوئی شاندار سالگرہ نہ آئے گی۔ یہ سب بنی بنائی ہوئی باتیں ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ بارھویں سال میں قدم رکھنے والا وجود خاصا عقلمند کم از کم معتبر ہو جاتا ہے +

گزشتہ سال ہمایوں کا سب سے بڑا سالگرہ نمبر نکالا گیا۔ سال بھر میں نوسو چھتیس صفحات پیش کئے گئے۔ معمول کے خلاف عموماً ایک سے زیادہ تصویریں شائع کی گئیں۔ چندہ بہت کم کر دیا گیا۔ مضامین میں تنوع اور دلچسپی کا خاص خیال رکھا گیا۔ شکر ہے کہ ان سب باتوں کو پبلک نے بنظرِ استحسان دیکھا اور خریداروں کی تعداد میں بقدر ایک ہزار کے اضافہ ہو گیا +

ہمایوں کا مطمحِ نظر باقاعدگی، میانہ روی، تنوع، سودمندی اور دلچسپی ہے۔ اس مطمح کے حصول میں ہمیں ہمیشہ اپنے معاونین کی اعانت اور ہمدردانہ رہبری کی ضرورت رہتی ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ بدستور سابق بلکہ بیش از پیش اپنی سرپرستی کا حق ادا کر کے ہمیں ممنون فرماتے رہیں کیونکہ کوئی صحیح اور بلند مطمحِ نظر بغیر مسلسل جد و جہد اور معاونت کے نہ ممکن الحصول ہوتا ہے نہ قابلِ حصول +

اپنے قلمی معاونین میں مفصلۂ ذیل اصحاب کی توجہ کے ہم خاص طور پر ممنون ہیں:-

حضراتِ فلک پیما، محمد حسین ادیب، فرحت اللہ بیگ، یلدرم، حسن نظامی، پریم چند، محمد عمر نور الٰہی، راس مسعود، عظیم بیگ چغتائی، حمید احمد خاں، منظور حسین ماہر، عاشق بٹالوی، فیاض محمود، منصور احمد، احسان احمد، منظور سروش، حامد حسن بلگرامی، مظہر انصاری، سید محمد کرمانی، آرزو جلیلی، نشتر جالندھری، حزہ خاں، مہر محمد خاں شہاب، ظفر واسطی، معین الحق حقی، سید محمد عبداللہ، تقی علی یاسمیؔ، شمیم، مہدیؔ، عبدالعزیز کلیم، لطیف الرحمن، احمد الدین مارہروی، احمد علی + شعرا میں حضراتِ جوش، احسن، اصغر، اثر، اکبر، وحشت، تاجور، اختر، عدم، راشد، ممتاز حسن نجیب، مقبول حسین احمد پوری، آزاد انصاری، امجد، جگر بریلوی، عابد، شاد عارفی، سیفی نوگانوی، ذوقی، صدق جائسی، محمد جمیل خاں راز، حفیظ ہوشیارپوری، زیبا، جاذب، لطیف انور، ریاض عباسی، علی منظور، مجاز، اسد، ملال + اور نسوانی مضمون نگاروں میں جناب اصغری خانم، ح ب صاحبہ، زب صاحبہ، بیگم شاہ نواز، بیگم بشیر احمد خاص طور پر قابلِ شکریہ ہیں +

ب ا

جہاں نُما

۱۹۳۲ء بھی اُسی طرح روا روی میں گزر گیا جس طرح ہر سال حال کی اس متمدن بے تاب دُنیا میں گزر جایا کرتا ہے اور حق یہ ہے کہ گزرے ہوئے سال نے کسی طرح دُنیا کو بڑے پیمانے پر فائدہ نہ پہنچایا۔ یوں تو یہ اپنے اپنے نقطۂ نظر پر منحصر ہے کہ کوئی گزرا ہوا سال ہمیں کیسا نظر آئے، اپنی اپنی قسمت اپنی اپنی ہمت پر منحصر ہے کہ وُہ ہمارے لئے اچھا ہو یا بُرا یا پھر اپنے اپنے اعتقاد و عزم پر اس کا دارومدار ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ دنیا ہمیشہ ترقی پر ہے، کوئی کہتا ہے کہ وہ جوں کی توں اپنی قدیم حالت پر قائم رہتی ہے اور تبدیلیاں اور انقلاب محض ایک ظاہری حیثیت رکھتے ہیں اور کوئی باآوازِ بلند چلاتا ہے کہ بھائیو بیدار ہو جاؤ اور ہُشیار کہ یہ ذلیل دُنیا سیدھی جہنم کو جارہی ہے، یہ تباہ ہونے والی ہے اور ہمیں بھی جلد اپنے ساتھ تباہ کر دینے والی ہے+

بہتر ہے کہ ہم اس عمومی مسئلے کا کہ دنیا ترقی پر ہے یا تنزل پر جواب ہی نہ دیں بلکہ ۱۹۳۲ء کے بعض واقعات پر ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈالیں اور جن حالات سے ہم عارضی طور پر متاثر ہیں اُن کا خاص طور پر ذکر کر دیں+

یہ ظاہر ہے کہ معاشی حیثیت سے دُنیا وہیں ہے جہاں سال بھر ہوا تھی۔ "سرد بازاری" میں کوئی گرم رو پیدا نہیں ہوئی کاروبار اُسی طرح مندا پڑا ہوا ہے۔ ملازم نوکریوں سے معزول ہو رہے ہیں مشاہرے گھٹ رہے ہیں۔ منافع کم ہو رہے ہیں اور چوری سینہ زوری کچھ بڑھ ہی رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ بھوکے آدمی کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے سو قومیں اور افراد جہاں لڑتے نہیں بھی وہاں کم از کم ایک دوسرے پر دانت ضرور پیستے رہتے ہیں یا بُرا منہ بنا کر ایک دوسرے سے رُوٹھے رہتے ہیں۔ متمدن انسان کی بھوک پیاس محض کھانے پینے کے لئے نہیں ہوتی+ وہ محض روٹی بوٹی یا کیک مٹھائی اور شراب کباب کا مشتاق نہیں بلکہ جب تک وہ دوسرے تیسرے سینما نہ دیکھ لے چوتھے پانچویں ناٹک کا مزا نہ لے لے، مہینے میں دو بار موٹر میں سو میل فرّاٹے بھرتا کہیں کو نہ نکل جائے، جب تک اُس کا مکان "اپ ٹو ڈیٹ" پوشاک "فیشن ایبل" سواری تیز رفتار اور معاشری حلقہ حسبِ دلخواہ نہ ہو وہ گویا بھوکا پیاسا رہتا ہے اور دوست دشمن ہر ایک کو کھاؤں پھاڑوں کرتا رہتا ہے+

رُوس والے تمدن کی انہیں متلون مزاجیوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور موجودہ دُنیا کو سرمایہ داروں کا قمار خانہ پکار کر حال کے تمدن اور طرزِ معیشت کو دُنیا کی ساری مصیبتوں کا سبب قرار دیتے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ موجودہ کساد بازاری اس تمدن کو پاش پاش کر دینے میں ایک عظیم الشان عالمگیر زلزلے کا کام دے رہی ہے+

لیکن ہونے نہ ہونے والا کچھ بھی ہو ظاہر ہے کہ دُنیا کی موجودہ معاشی و سیاسی حالت کسی طرح زیادہ تسلی بخش نہیں ہے+

رُوس کا حال بہت اچھا ہو نہایت بُرا ہو یا اچھا خاصا ہو اِس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ رُوس کی انقلابی حکومت قائم ہے اُس کے متزلزل ہوجانے کی بالفعل کوئی صورت نظر نہیں آتی، وہاں بہت سے نئے تجربے ہو رہے ہیں، کم از کم شہروں کے مزدور پیشہ لوگ بہت خوش ہیں اور رُوس کی ان تبدیلیوں کا کم و بیش اکثر ممالک پر اثر پڑ رہا ہے۔ پُر لطف بات یہ ہے کہ وہ شخص بھی جو رُوس کے ذکر سے فوراً چیں بہ جبیں ہوجاتے ہیں عموماً اُس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رُوس ایک طرف ہے اور باقی ماندہ دُنیا دوسری طرف۔ وہاں ایک طرح کا نظام جاری ہے یہاں دوسری طرح کا۔ وہاں ایک نئے تجربے پر جوش اور شور و غوغا ہے یہاں ایک بگڑتی ہوئی کل کی درستی میں مصروفیت اور آپس میں تُو تُو میں میں۔ لیکن غور سے دیکھیں تو بچارا رُوس بھی اپنی نئی مشکلات میں گرفتار ہے۔ لائحہ عمل بنانے آسان ہوتے ہیں لیکن اُن پر عمل درآمد مشکل ہوتا ہے۔ نئے رُوس کے اربابِ حل و عقد اپنے تجربے سے دیکھ رہے ہیں کہ سرمایہ داری کی ہر ادا اتنی بُری نہیں جتنی اُنہیں پہلے معلوم ہوئی تھی۔ اِسی لئے گزشتہ سال رُوس کی اشتراکیت نے اپنی حکمتِ عملی کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے بعض طے شدہ اصولوں میں تبدیلی کرلی ہے مثلاً اب وہاں بعض کارخانوں کا انتظام بجائے ایک کمیٹی کے ایک ہی منتظم کے ہاتھ میں دیا جانے لگا ہے اور مزدوروں کو اُجرت اچھے کام کے مطابق دی جانے لگی ہے۔ نیز انفرادی تجارت اور انفرادی منافع کو اب اتنی بُری نظر سے نہیں دیکھا جاتا جتنا پہلے دیکھا جاتا تھا۔ ہر انتہائی و انقلابی نوع کی تحریک میں بتدریج اعتدال پیدا ہوکر دُنیا کی نظروں میں وہ زیادہ قابلِ قبول ہوجاتی ہے۔

۱۹۳۲ء عالمگیر کانفرنسوں کا سال تھا، لوزان کانفرنس میں یہ طے پایا کہ جرمنی سے یہ توقع کہ وہ اور نصف صدی تک تاوانِ جنگ دئے چلا جائے محض لغو ہے۔ آفت زدہ یورپ کی "مرمت" کے لئے ایک فنڈ تجویز کیا گیا جس میں جرمنی نے ایک مقررہ رقم دینے کا وعدہ کیا۔ وسطی و شرقی یورپ اور بالخصوص غریب آسٹریا کو مالی امداد دینے کی تجویز ہوئی اور سب سے اہم یہ کہ ایک عالمگیر معاشی کانفرنس مدعو کرنے پر اتفاق رائے ہوگیا۔ اس کے مقابل میں جینوا میں جو تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس منعقد ہوئی وہ ناکام رہی اور اِس ناکامی کو چھپانے کے لئے دُنیا کو یہ بتا دیا گیا کہ ہم نے "ہوائی گولہ باری اور "کیمیائی جنگ" کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ جہازوں کی جسامت کو کم کردیا ہے اور اس بات میں ایک دوسرے کی تائید کردی ہے کہ واقعی جنگی سامان پر خرچ کم کرنا چاہئے۔ اٹاوا میں برطانوی سلطنت کے تمام مقبوضات و نوآبادیات کا اجتماع ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُدھر برطانیۂ عظمےٰ نے اپنی ساری سلطنت کے اِرد گرد ایک قسم کی محصولی دیوار کھڑی کردی کہ ہم اِس احاطے کے اندر رہیں، اندر خوب مزے سے ایک دوسرے سے تبادلۂ اشیاء کیا کریں گے اور یوں اوروں کے مقابلے میں روز بروز زیادہ متمول و مضبوط ہوتے جائیں گے۔

بین قومی حیثیت سے سال کا دوسرا بڑا سلسلۂ واقعات مانچوریا کے قضیے پر مشتمل تھا۔ جس کی لاٹھی

اُس کی بھینس - اِس اندوہ ناک واقعے میں لاٹھی والا جاپان تھا اور بھینس چینی بھینسوں میں سے ایک موٹی تازی بھینس مانچوریا۔ ایک عرصے سے جاپان مانچوریا سے لَو لگائے بیٹھا تھا - جاپانیوں نے وہاں مُلک کے طول و عرض میں مدتوں سے اپنے معاشی "مفاد" پھیلا رکھے تھے - اب اِن کی حفاظت لازم تھی۔ جاپان اُستادِ مغرب کا ایک ہوشیار شاگرد ہے - اُس نے اپنی سب چالیں اُسی گرگِ باراں دیدہ سے سیکھی ہیں - جب موقع دیکھا اچھائی برائی کو پس پشت ڈالا اور اپنا اُلّو سیدھا کر لیا۔ مغرب سارے کا سارا معاشی سرد بازاری کا شکار ہو رہا تھا - سب جنگ سے تنگ آئے ہوئے تھے - انگلستان ہندوستان کی ہلچل میں پھنسا ہُوا تھا - جاپان نے چپکے سے جا کر مانچوریا پر قبضہ کر لیا اور وہاں ایک نام نہاد "مانچوکُو او" حکومت قائم کرا دی - چین نے بہتیرا شور مچایا کہ اِس بانی کار بیڑے کو روکو پکڑو سنبھالو مگر وہاں کس میں زور تھا کہ ہمت کرتا۔ بیچاری معصوم نیک نیت مجلسِ اقوام نے ایک کمیشن بٹھا دی - انہوں نے تھوڑی مدت ہوئی ایک رپورٹ شائع کی جس میں جاپانیوں پر نکتہ چینی کی گئی اور ایک ایسی منصفانہ تجویز پیش کی جو کمیشن کے نزدیک دونوں ملکوں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر جاپان نے اِس رپورٹ کو اپنے غرورِ قوت میں ٹھکرا دیا - چین مجلسِ اقوام، متمدن دُنیا کی رائے عامہ یہ سب ایک طرف ہیں اور حضرتِ جاپان اور اُن کی بحری و بری طاقت دوسری طرف - وہ پڑے چلّایا کریں یہ مانچوری گٹھڑی کو بغل میں دبائے مزے سے خرّاٹے لے رہے ہیں۔ اس زبردستی اور ستم رانی سے مجلسِ اقوام کی رہی سہی آبرُو بھی جاتی رہی ہے اور ساری دُنیا پر ظاہر ہو گیا ہے کہ بغیر فوجی قوت کے مجلسِ اقوام محض بھلے مانس لوگوں کی ایک بحث گاہ ہے اور کچھ نہیں۔

تیسرا قابلِ غور امر دُنیا کی معاشی سرد بازاری ہے جو ہنوز جاری ہے - لوازن کانفرنس نے فرانس اور جرمنی کی گتھی کو ایک حد تک سلجھا دیا - یورپ نے بیٹھ کر آپس میں صلح کر لی لیکن اِن مفلسوں کو یہ یاد نہ رہا کہ اِن کا قرض خواہ، امریکہ اِن کے سمجھوتے کو خاطر میں نہ لائے گا اور اپنا "آدھ سیر گوشت" برابر طلب کرے گا۔ وہی ہُوا - امریکہ نے انگلستان اور فرانس دونوں کو گویا نوٹس دے دیا کہ میرا قرضہ اور سُود تیار رکھو، ادائیگی کا وقت قریب آ گیا ہے - اب یہ گھبراتے ہیں اور بڑے بڑے عقلمندانہ جواب اختراع کرتے ہیں کہ ہم تو اصل سے بہت زیادہ ادا کر چکے - اب آپ کیوں خواہ مخواہ دُنیا کے معاشی توازن کو بگاڑتے ہیں۔

ان بین قومی مسائل کے بعد مختلف قوموں پر نظر ڈالو تو سب سے پہلے اپنے وطن کی عجیب حالت نظر

آتی ہے۔ برطانوی سلطنت میں جا بجا آسٹریلیا میں، نیوزی لینڈ میں، انگلستان میں پرانی مزدور پارٹی کی طاقت خاک میں مل چکی ہے اور انگلستان میں تو قدامت پسند لوگ اپنے پورے زوروں میں ہیں۔ اِس کا سب سے زیادہ اثر ہندوستان میں محسوس ہو رہا ہے۔ کہاں وہ دن کہ ارون گاندھی جی کو دیوتا سمجھ کر ہر طرح اُن کی خاطر مدارات کرتا تھا اور کہاں یہ دن کہ جو حکومتِ ہند کو کرنا ہوتا ہے اُس کے لئے ہر بار لنلتھ سے بڑے پُر زور حکم آتے ہیں۔ حکومت حکومت کرنے اور زور دکھانے اور سیاسی شورش کا مُنہ خاک سے بھر دینے کی قائل ہے۔ کانگرسی تحریک دب رہی ہے۔ انگلستان کے رُعب کا ڈنکا بج رہا ہے۔ فضائے ہند تاریک ہو رہی ہے۔ دیکھئے کیا ہو؟ سال کے شروع میں گاندھی جی گرفتار ہوئے، اور پھر ادھر آرڈی نینسوں کے پٹاخے ایک ایک کر کے چھوڑے گئے۔ ادھر بم اندازوں نے اپنے کرتب دکھانے شروع کئے۔ فرقہ وار تصفیے کا پتھر پھینکا گیا جس سے سیاسی تالاب میں کچھ مچھلیاں اُچھلیں اور کچھ مینڈک ٹرائے۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئے۔ سال بھر میں الہ آبادی کانفرنس کی مشکوک کامیابی کے علاوہ صرف دو دل خوش کن باتیں ہوئیں۔ ایک گاندھی جی کی فاقہ کشی سے اچھوتوں اور ہندوؤں کا ملاپ اور دوسرے ہندوستانی کرکٹ اور ہاکی کے کھلاڑیوں کا بیرونی ممالک میں اپنا سکّہ جمانا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، یہی غنیمت ہے۔

دوسرے ملکوں میں سب سے زیادہ شورش جرمنی میں برپا رہی۔ صدرِ جمہوریہ ہنڈن برگ کی پیرانہ سال سرد مزاجی نازیوں کی جوان بے تابی سے برسرِ پیکار ہے۔ نوجوان جرمن "تاوانِ جنگ"، الزامِ جنگ اور اس قسم کی ہر ہتک پر برافروختہ ہو رہے ہیں اور دُنیا کی مجلس میں دوسروں کے برابر بیٹھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ فرانس نے جرمن بے صبری سے خائف ہو کر رُوس تک سے پُر امن معاہدہ کر لیا ہے۔ آئرلینڈ باوجود اپنی کمزوری کے ڈی ویلرا کی قیادت میں انگلستان سے لڑ جھگڑ رہا ہے اور اپنی آزادی کو پوری طرح استعمال کرنا چاہتا ہے۔ سیام نے اپنے بادشاہ کو ترغیب دے کر "دستوری" بادشاہ بنا دیا ہے۔

غرض ۱۹۳۲ء کچھ صلح و امن کی کوششوں اور کچھ جوش اور جبر کے مظاہروں میں گزرا لیکن اگر اِس اُبال اُچھال کے بعد ۱۹۳۳ء میں نوعِ انسان کے لئے کوئی معجونِ مرکب تیار ہو جائے تو یہ ساری مصیبت کسی کام آ جائے۔

ر۔ ا

بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
سازِ دلِ وحشی کے
ٹوٹے ہوئے تاروں پر
پھر چوٹ لگائے جا، رو رو کے رُلائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
انجام سے بے پروا
آغاز کی باتیں کر،
معصومیٔ الفت کے انجان اشاروں پر،
نیک و بدِ عالم سے
بیگانہ بنائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
مجبوریٔ الفت کے،
اندوہِ محبت کے
دن یاد دلائے جا، رو اور رُلائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
مرگِ دلِ غمگیں کے
افسانۂ خونیں کا
ہر باب سنائے جا، مٹ اور مٹائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
پھر اُس کی محبت کا دیوانہ بنائے جا
اُس حُسنِ فروزاں کا پروانہ بنائے جا
جَل اور جلائے جا،
جی اور جِلائے جا،
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

حامد علی خاںؔ



بھولے ہوئے افسانے

خوشی کی تسخیر

اکثر لوگ خوشی کے طلب گار نظر آتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ اس طلب میں عموماً کامیاب نہیں ہوتے۔ لوگ ناخوش کیوں ہیں؟ کیا اس کی وجہ قسمت ہے؟ بہت سے مذہبی لوگوں کو اس بات کا پورا یقین ہے یا کیا اس کی وجہ معاشری نظام ہے؟ مغربی حکما روز بروز اس عنصر کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے اور بہترین فطرت شناس اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کی ناخوشی بہت کچھ اُس کی اپنی ناسمجھی اور کم ہمتی کے سبب سے ہے اور اگر ہر انسان اپنی اپنی جگہ ضبطِ نفس اور دُوراندیشی سے کام لے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تھوڑے عرصے میں پہلے سے بُہت زیادہ خوش اور مطمئن نہ ہو جائے۔

اس موضوع پر پرانے اور نئے زمانے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اُن مسائل میں جو صدیوں سے انسان کے دماغ میں چکر لگاتے رہے ہیں یہ مسئلہ بھی شامل ہے کہ میں کیا کروں جس سے میری زندگی زیادہ مسرور اور میرے اور دوسروں کے لئے زیادہ تسلی بخش ہو جائے۔ جنگِ عظیم کے بعد جہاں لُطف اندوزی کے مختلف پہلوؤں پر غور اور بحث کی گئی ہے وہاں خوشی کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ افراط تفریط کو چھوڑ کر اگر ہم یورپ کے موجودہ اعتدال پسندوں کو لیں تو ہمیں مُتمدّن دُنیا کے مستقل میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ سڈنی ڈارک نے چند سال ہوئے ایک مختصر کتاب لکھی تھی "زندگی سے کس طرح لُطف اُٹھایا جائے"۔ حال میں شہرۂ آفاق انگریز فلسفی برٹرنڈ رسل نے اس موضوع پر ایک معرکۃ الآرا عام فہم تصنیف پیش کی ہے "خوشی کی تسخیر"۔ رسل ایک اشتراکیت پسند حُریت پرست مفکّر ہے لیکن نہ اتنا جتنے یورپ اور امریکہ کے بعض اور مفکّرین اور غالباً اتنا بھی نہیں جتنی اُس کی موجودہ بیوی ڈورا رسل جس نے پانچ سال ہوئے ایک کتاب تصنیف کی تھی "خوش رہنے کا حق"۔

مضمونِ ہذا زیادہ تر رسل کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ جہاں بعض خیالات کو اس سے تعلق نہیں وہاں کسی نہ کسی طرح اس امر کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً کہیں قوسین میں کچھ عبارت ہے اور کہیں فٹ نوٹ ہیں۔ یہ فٹ نوٹ تمام تر سڈنی ڈارک کے خیالات کا عکس ہیں۔ عموماً یہ متن سے تطابق رکھتے ہیں، لیکن گاہے گاہے ان میں اختلاف کی جھلک نظر آتی ہے۔

How to Enjoy Life by Sydney Dark (1924)

The Conquest of Happiness by Bertrand Russell (1930)

The Right to be Happy by Dora Russell (1927).

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے موخر الذکر کتاب میں ایک زیادہ جنگجویانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ وہ زیادہ تر قدیم رسم و رواج اور قدیم خیالات کی مخالفت پر مشتمل ہے اور نئی آزادی کے نئے پُرجوش خیالات کی ترجمان ہے۔ اس کے برعکس "خوشی کی تسخیر" کو معاشری اِدارات سے واسطہ نہیں۔ رسل نے معاشرہ کی خرابیوں اور اُن کے انسداد کے متعلق اپنی دوسری تصانیف میں اظہارِ خیالات کیا ہے، موجودہ تصنیف میں وُہ صرف اس بات پر غور کرتا ہے کہ ہر فردِ بشر بحالاتِ موجودہ کس حد تک از خود اپنی زندگی کو خوش تر بنا سکتا ہے۔ مرقومۂ ذیل مضمون زیادہ تر اسی تصنیف پر مبنی ہے +

خوشی کی تسخیر! ہاں خوشی بڑی حد تک انسان کی انفرادی کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے مُسخّر کی جا سکتی ہے، ایک ناخوش آدمی اگر دل سے چاہے اور خوب غور کرے اور مُسلسل کوشش کرے تو اپنی زندگی کو بجائے دُکھ کی ایک کہانی کے ایک پُرلطف داستان بنا سکتا ہے۔

ہم ایک معمولی اوسط آدمی کا ذکر کریں گے۔ دُنیا میں غیر معمولی آدمی کم ہیں معمولی آدمی زیادہ ہیں۔ ابراہیم لنکن کا قول ہے "خدا معمولی مردوں عورتوں سے ضرور محبت رکھتا ہے دیکھو تو اُس نے کتنے معمولی آدمی بنائے ہیں۔ پس ہمیں یہاں غیر معمولی انسانوں سے تعلق نہیں جو یا خوش نہ رہنا چاہیں یا جو ایسی چیزوں سے خوشی حاصل کر سکیں جس سے عام نوعِ انسان استفادہ نہ کر سکے۔ نہ یہاں اُن لوگوں کا بیان مقصود ہے جن کے پاس پیٹ بھرنے کو کھانا، تن ڈھکنے کو کپڑا یا آندھی اور بارش سے بچنے کو ایک اندھیری کوٹھڑی بھی نہیں یا جن کی صحت اس قدر خراب ہے کہ زندگی اُن کے لئے ایک مسلسل عذاب ہے یا جنہیں ظلم کرنے میں مزا ملتا ہے، یا بچوں سے نفرت ہے یا بجائے محبت کئے جانے کے نفرت کئے جانے میں لُطف آتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان بدبختوں کا مرض لاعلاج ہے۔ لیکن ہم اس مضمون میں ان مریضوں سے مُنہ پھیر کر ایسے ہم جنسوں کی طرف توجہ کریں گے جن کی کمزوریاں اور غلطیاں نہ غیر معمولی قسم کی ہیں اور نہ محض غلط قسم کے معاشری اِدارات کا نتیجہ ہیں بلکہ جو اپنی خرابیوں کو اُن عام اصُولوں کی پیروی سے خود دُور کر سکتے ہیں جو مشترک انسانی تجربے سے حاصل ہو چکے ہیں۔

آؤ پہلے دیکھیں کہ لوگوں کی ناخوشی کے کیا اسباب ہیں؛ پھر ہم غور کریں گے کہ اُن کی خوشی کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں؛

اِنسانی ناخوشی کے دو بڑے سبب ہیں۔ اول نامناسب بیہودہ اور غلط نوع کے معاشری اِدارات مثلاً دقیانوسی رسم و رواج، بے معنی مذہبی توہمات، عالمگیر معاشی اِدارے جن کے طفیل نوعِ انسان کے کمزور اور اسفل طبقے صدیوں سے متمول

خوش قسمتی سے مافوق البشر انسان عنقا ہے۔

خوشی کے لئے نہ دولت لابدی ہے نہ صحت۔ اطمینان کی شاہراہ سوائے چند اشخاص کے باقی سب نوعِ انسان کے لئے کھُلی ہے۔

قومی تعصبات کی بیخ کنی دائمی عالمگیر صلح کا اولیں لازمہ ہے۔

اور برسراقتدار اشخاص کے ظلم وستم سہتے رہے ہیں اور گاہے گاہے بغاوتوں اور انقلابوں میں اپنے جی کا بخار نکال کر داد خواہی اور آزادی کی تحریکات کو تقویت دیتے رہے ہیں۔ ڈوور آرسل کہتی ہے کہ انسانی خوشی زیادہ تر دُنیا کے متعلق اُن نظریات پر منحصر ہے جن پر نوعِ انسان وقتاً فوقتاً یقین رکھتی اور عمل کرتی رہی چینیوں نے انسانی جبلت کی ضروریات کو بہت کچھ سمجھا، یونانیوں نے نفسی وجسمانی فعلیت میں تطابق پیدا کیا لیکن عیسائیت نے آکر ممنوعات ونواہی پر زندگی کی بُنیاد ڈالی اور انسان کے فطری میلانات کا گلا گھونٹ کر نوعِ انسان کو نیم مُردہ کر دیا۔ یونانیوں اور رومیوں کا تمدن فطرت کے زیادہ قریب تھا، عیسائیت کی غیر فطری پاکبازی نے انسان کو فطرت اور صحیح زندگی سے دُور جا پھینکا۔ ملحدین اور طبیعین نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن وہ دوسری طرف حد سے بڑھ گئے۔ یعنی انہوں نے صرف عقل کے بت کی پرستش کو اپنا شعار ٹھہرایا اور یہ نہ سمجھا کہ عقل اور جبلت دونوں ہی کے مناسب امتزاج سے زندگی اصلی معنوں میں زندگی بن سکتی ہے۔ اور زندگی محض جہد للبقا نہیں بلکہ جب تک اس میں امن ترغیب آہستگی بھی مدد نہ دیں وہ کبھی صحیح زندگی نہیں کہلا سکتی۔ ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے لئے نئے میدان عمل تیار کر کے اُنہیں آزاد چھوڑ دے، وہ نئی قسم کے انسان پیدا کرے، اور محض نئی قسم کے مرد اور عورتیں ہی نہیں بلکہ وہ پیدا کرے بہتر صحت بہتر قوت بہتر زوجی اتحاد تاکہ ان نئے سانچوں میں ڈھل کر نوعِ انسان خود بخود بہتر و مضبوط تر ہوتی جائے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے متعدد معاشری تغیرات کی ضرورت ہے کچھ اُس قسم کے سیاسی ومعاشی زلزلے جیسے فرانس اور امریکہ اور حال میں ٹرکی اور چین اور رُوس میں برپا ہوتے رہے ہیں +

ہمارے پاس گنجائش نہیں کہ ہم ان عام معاشری تبدیلیوں پر روشنی ڈالیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ہم یہاں صرف ناخوشی کے انفرادی وجوہ پر غور کریں گے اور یہ ہے انسانی ناخوشی کا دوسرا سبب اور یہی ہے جس کی مختلف صورتوں کا ہم بتفصیل ذکر کریں گے۔

جسمانی صحت دنیاوی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ انسان جسم و روح سے مرکب ہے۔ وہ محض ایک فرشتہ یا ایک روحانی ہستی نہیں بلکہ ایک جسم رکھتا ہے جس کی درستی کے بغیر وہ اس دنیا میں کوئی بڑا مفید کام نہیں کر سکتا۔ رُوح یا نفس کی قوت کے لئے عموماً جسم کی قوت درکار ہوتی ہے۔ انسان کا نصب العین یہ ہونا چاہیے۔ کہ اس کا جسم صحت مند اور قوی ہو اور اس میں ایک صحت مند اور قوی رُوح آباد ہو۔ ہرچند تمدن کی پیچیدہ طرزِ زندگی نے اس کو ایک مشکل کام بنا دیا ہے۔ تاہم ایک معمولی آدمی اگر سمجھداری سے کام لے تو اپنی ذرا ذرا سی جسمانی ضروریات کی طرف توجہ کر کے وہ اپنے جسم کو درست حالت میں رکھ سکتا ہے۔ بالعموم جسم کے

ہر پرانی شے کو لغو جاننا اتنا ہی فضول ہے۔ جتنا ہر نئی شے کو بیہودہ سمجھنا +

جسمانی تسکین کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ اس کا مسرت اور تخیل پر کیا اثر پڑا +

جسم کا کام ہے کہ وہ اس مرمریں تخت کے سامنے جس پر روح انفرادی زندگی کی حکمران ملکہ بن کر بیٹھتی ہے ایک تابع خادم کی طرح ہمہ تن خدمت کو تیار کھڑا رہے۔

تمام اعضا کی روزانہ ورزش فطرت کا تقاضا ہے۔ جہاں ان میں سے کسی کی طرف غفلت برتی گئی وہ تھوڑے ہی عرصے میں گویا زنگ آلود ہوگیا۔ مختلف کھیل جن میں ہاتھ پاؤں ہلیں جلیں ٹہلنا دوڑنا تیرنا گھوڑے کی سواری وغیرہ وغیرہ مہذب آدمی کے لئے ان میں سے ایک نہ ایک بلکہ چند اقسامِ ورزش کا اختیار کرلینا ضروری ہے۔ کھانے پینے کا مسئلہ بغایت اہم ہے۔ معدہ جسم کا انجن ہے۔ جہاں یہ رکا۔ سب کی سب گاڑیاں آپ سے آپ رُک گئیں۔ جہد للبقا کے معنی سیدھی سادھی زبان میں پیٹ بھرنے کے لئے ہیں لیکن پیٹ کو مناسب طرح بھرنا ایک نہایت دقیق سوال ہے۔ کیا چیز کس طور پر کتنی کھائی جائے اس معاملے میں غفلمند سے عقلمند آدمی غلطی کرجاتے ہیں۔ بچوں میں ادب آداب کا اور بڑوں میں ضبطِ نفس کا پہلا سبق کھانے پینے سے شروع ہوتا ہے۔ خواہ یہ مضحکہ خیز ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ معدے کی نگہداشت روحانی ترقی کا پہلا قدم ہے۔ ورزش، خورد نوش، سیر وتفریح، سکون وحرکت جسمانی صحت کے لئے ہر کام اور ہر شے میں اعتدال کی ضرورت ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ جیسا کہ ہم دیکھیں گے راہِ اعتدال ہی عام طور پر جسم وروح کے لئے صحیح راہِ زندگی ہے۔

اپنی نگہداشت ضروری ہے جسمانی ونفسی نگہداشت لیکن اعتدال کے ساتھ کہ جو اپنا بھی حد سے زیادہ نگہدار بن گیا۔ جو صرف اپنے آپ میں مستغرق ہوگیا اور دوسروں سے بے تعلق وہ پھر صحیح آزاد زندگی سے بھی بے تعلق ہوگیا۔ ناخوشی کے وجوہ میں رسل سب سے پہلے خود اندیشی کا ذکر کرتا ہے خود اندیشی ایک خطرناک مرض ہے۔ جس کا اگر جلد سدّباب نہ کیا جائے تو وہ شخصیت کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ خود اندیش آدمیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک ہے وہ گناہ گار یا گناہ اندیش آدمی جس کے سر پر ہمیشہ گناہ سوار رہتا ہے۔ بچپن میں پاکبازی کی غلط تعلیم نے اُسے ہزارہا گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیا۔ اب اُسے ہر بے ضرر شے میں بھی گناہ ہی گناہ نظر آتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی کسی چیز سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ایک اور قسم ہے وہ خود پسند شخص جو آپ اپنی تعریف کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر کہ ومہ اس کی تعریف ہی کیا کرے۔ وہ دنیا بھر کو اپنا حاضر وغائب عاشق بنانا چاہتا ہے۔ خود کسی سے محبت نہیں کرتا لیکن خواہشمند ہے کہ دوسرے اسے دل وجان سے چاہیں اور روز وشب اس کے کارناموں کی داد دیں۔ اس کا سبب کسی خاص قسم کی کوتاہی ہے۔ اور اس کا علاج صحیح قسم کی خودداری ومشغولیت ہے + ان کے علاوہ قوت جو شخص ہے جو دنیا بھر پر اپنی طاقت کا سکہ جما لینے کا آرزومند ہے۔ تمام دیوانے اور اکثر اکابرِ عالم اس نوع کی مثالیں ہیں سکندرِ اعظم نپولین اعظم قیصر ولیم مسولینی دنیا بھر اپنا لوہا منوانے پر مصر نظر آتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ بیشک ایسے ہی بڑے آدمیوں نے بعض باتوں میں دنیا کو ترقی دی لیکن اکثر ایسے لوگوں کے ہاتھوں قومیں اور نوعِ انسانی تباہ بھی ہوئی۔ خود اندیشی اور استغراقِ ذات

دورِ حاضر میں معدے کی اہمیت زیادہ ہے ضمیر وروح کی کم۔

زندگی کا لطف زیادہ تر ضبطِ نفس اور عام فہم پر منحصر ہے۔

ہم اپنی تنگ اندھیری کوٹھڑیوں میں بھاری بھرکم پردے چھوڑے پڑے رہتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ کیسی کیسی خوبصورتیاں ہمارے ارد گرد منڈلا رہی ہیں۔ اپنے آپ سے گریز کی آرزو لغو ہے۔ ہم اپنے آپ سے گریز نہیں کرسکتے۔ ہاں ہم یہ کرسکتے ہیں کہ اپنے نفس کو بیرونی روشنی سے منور ہوجانے دیں

کا علاج معروضی زندگی ہے یعنی اپنے آپ سے زیادہ دلچسپی کم کرکے دوسرے اشخاص اور اشیا میں دلچسپی لینا۔ رسل کہتا ہے جب میں ابھی پانچ برس کا تھا تو میں اس خیال سے کانپ جاتا تھا کہ مجھے ستر برس تک زندہ رہنا ہے جب میں جوان ہُوا تو صرف ریاضی کے مسائل کی لطف اندوزی نے مجھے خودکشی کرنے سے روکا۔ اب ادھیڑ عمر میں میں زندگی سے بہت زیادہ لطف اُٹھاتا ہوں جس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ میں نے بہت سی اُن چیزوں کو حاصل کیا جن کی مجھے خواہش تھی، کچھ یہ کہ میں نے بعض فضول خواہشات کو چھوڑ دیا لیکن زیادہ تر میری بڑھتی ہوئی خوشی کا باعث یہ ہُوا کہ میں نے فقط اپنی ذات میں منہمک رہنا چھوڑا اور خارجی دنیا کی مختلف اشیا میں روز بروز بیش از پیش دلچسپی لینی شروع کی۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ناخوش آدمی وہ ہے جو کسی فطری تسکین سے محروم ہو کر بظاہر یا بباطن اُسی تسکین کے لئے بیقرار رہتا ہے اور اپنی زندگی کو صرف ایک ہی سمت میں دھکیلے لئے جاتا ہے اور یوں باقی دُنیا و ما فیہا سے علیحدہ منقطع ہو جاتا ہے۔

للّہی ناخوشی ناخوشی کی ایک شکل ہے جس کا شکار عموماً بعض عقلمند لوگ ہوتے ہیں یعنی یہ خیال اور احساس کہ ہم نے چیزوں کی ماہیت کو خوب پرکھ لیا ہے اور زندگی میں کوئی شئے نہیں رہی جس کے لئے آدمی جیئے جائے۔ یقینی خوشی دنیا میں کوئی نہیں ہر جگہ شک وشبہ کی گنجائش ہے، ہمدردانہ محبت ڈھونڈے سے نہیں ملتی، بلند علم ادب کا وجود کالعدم ہے۔ چیزیں فضول ہیں دُنیا فانی ہے زندگی بے معنی ہے۔ ایسے خیالات کا سبب بالعموم مادی ضروریات کا آسانی سے پورا ہوجانا ہے اور اُن خیالات میں دو عنصر ہوتے ہیں تلونِ مزاج اور غلط توجیہ۔ تلونِ مزاج کے دورے یا طبیعت کی ترنگ کا تو دُنیا میں کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ آدمی دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہو اور کسی مفید کام میں مصروف ہو جائے لیکن نام نہاد وجوہ کا صریح جواب یہ ہے کہ یقین و اعتقاد کے پیچھے پڑے رہنا اور اُن کے بغیر بچوں کی طرح چلاتے پھرنا کوئی عقلمندی کی نشانی نہیں، شکوک وشبہات زندگی کا جزو ہیں اور ایک صحیح الدماغ شخص کو ان سے عہدہ برا ہو سکنا چاہئیے۔ اور محبت کی ہمدردی دوسرے کی نکتہ چینی سے کم نہیں ہوتی بلکہ صحیح محبت وہی ہے جس میں سچی نکتہ چینی کام کرے۔ باقی رہا علم ادب سو علما و فضلا اگر بجائے اپنے دائرے میں گھومنے کے لوگوں سے واسطہ پیدا کریں باہر دُنیا میں جا نکلیں اور بلا تکلف زندگی سے دوچار ہوں تو وہ دیکھیں کہ ان

مختلف لوگوں کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرو اور دیکھو کہ انھوں نے زندگی کو کس کس مختلف طرح دیکھا اور بسر کیا ہے۔

اچھی زندگی کا مقصد انسانی مسرتوں میں اضافہ کرنا ہے۔

جو اس زندگی میں خوش رہنا چاہے اسے یقین رکھنا چاہئیے کہ یہ زندگی واقعی جینے کے قابل ہے۔

اکثر اپنے جی کی لہر پر ہی کام کرنا جہالت ہے۔

ہر قسم کے سچے لگاؤ میں درست قسم کی نکتہ چینی شامل ہوتی ہے۔

کے تخیلات و تصورات و افکار میں ایک زیادہ زندہ قوت رونما ہو جائے۔ اور دُنیا فانی ہے تو یہ کوئی رونے کا مقام نہیں،
عقلمند آدمی مستقبلِ بعید سے ڈر ڈر کر نہیں مرتا بلکہ حال میں کمال پیدا کرتا ہے اور جن چیزوں سے اور جن واقعات سے
مفر ممکن نہیں انہیں خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عشق و محبت میں ناخوش رہنے
والے بہت بے انصافی کرتے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ محبت کے لُطف میں بھی ایک خلش ہے حالانکہ محبت کی مسرت دُنیا
جہان کی مسرتوں سے زیادہ مسرت خیز ہے۔ محبت میں کیوں اتنا لُطف ہے اس کا جواب ذرا مشکل ہے لیکن اول تو ظاہر ہی
کہ محبت بجائے خود اور گویا بلا وجہ لُطف کا اک سرچشمہ ہے اور دوسرے یہ کہ محبت سے دُنیا کے سارے دوسرے لُطف مثلاً
موسیقی، طلوعِ آفتاب یا ماہتاب دوبالا ہو جاتے ہیں۔ جس شخص نے اپنی محبوبہ کے ساتھ مل کر خوبصورت اشیا سے لُطف نہیں اُٹھایا
اُس نے زندگی کی اِن خوشیوں کا پُورا بھید نہیں سمجھا۔ علاوہ بریں محبت انانیت کے خول کو توڑ دیتی ہے کیونکہ اس کا لُطف محض تعاون
اور تعاون سے حاصل ہوسکتا ہے۔ محبت اشتراکِ عمل ہے اس اشتراکِ عمل میں بعض خاص قدروں کا پتہ چلتا ہے جن سے بغیر
اس اشتراک کے مکمل طور پر لُطف اندوزی ناممکن ہے۔

موجودہ مغربی تمدن کو ایک اور گھُن لگا ہُوا ہے مقابلہ۔ آج کل یہ کہنے سننے کا فیشن ہے کہ زندگی جہدللبقا ہے۔ یہ
لقا کے لئے جدوجہد دراصل کامرانی کے لئے جدوجہد ہے ورنہ صحیح جہدللبقا تو وہ ہے جو ایک جنگلی درندہ یا ایک وحشی انسان
یا ایک نہایت ہی غریب آدمی اپنا پیٹ پالنے کے لئے کرے۔ زمانۂ حال کے انسان کی بے کلی اور تڑپ اور کوششیں
زیادہ تر مسابقت کے خیال کا نتیجہ ہیں۔ یورپ یا امریکہ کے کسی بڑے یا معمولی کاروباری آدمی کی مصروفیتوں کا عالم دیکھو صبح
اُٹھتا ہے جلد جلد تیار ہو کر ناشتہ کر کے سیاہ لباس پہن کر ریل یا موٹر میں بیٹھ کر اپنے دفتر میں وارد ہوتا ہے اور ایک نہایت
متین اور درشت سا رویہ اختیار کر کے اپنے کارکنوں سے کام لیتا ہے۔ اخبار اُٹھاتا ہے اور تازہ ترین کاروباری معاملات
سے واقفیت حاصل کر کے مختلف اجناس و حصص کی بڑھتی گھٹتی قیمتیں جانچ کر بیوپار کا جائزہ لیتا ہے۔ کسی بڑے ساہوکار کے
ساتھ کسی پبلک طعام گاہ میں کھانا کھاتا ہے اور سارا وقت کاروباری گفتگو کرتا ہے۔ شام کو تھکا ماندہ گھر آتا ہے بیوی نے غالباً
کسی دور دراز رہنے والے دوست کو شام کے کھانے پر مدعو کیا ہوتا ہے اور پھر سب کو مل کر تھیٹر جانا ہے لیکن یہاں میاں کے
دماغ میں وہی نرخ کا چڑھ جانا بازار کا گر جانا قیمتوں کا اندازہ اجناس کا موازنہ چکر لگا رہے ہوتے ہیں وہ جمائیاں لیتا ہے
اور نصف شب کے قریب جا کر اپنے بستر پر دراز ہو جاتا ہے اور سونے میں بھی انہیں باتوں کے خواب دیکھتا ہے۔ بھلا ایسی
زندگی میں خواہ وہ کامران ہو یا ناکام خوشی کو کس قدر دخل ہوسکتا ہے، خانگی خوشیاں اور دوستانہ تعلقات بھی مشین کے پرزوں

ہر ایک کا انحصار سب پر ہے اور سب کا انحصار ہر ایک پر۔

ہر شخص جبھی مطمئن رہ سکتا ہے کہ وہ زندگی کے عام امور و واقعات اور اپنے انفرادی حالات کو خوشی کے ساتھ قبول کر لے۔

کی طرح چلتے رہتے ہیں جن سے کام کرنے والے کو کسی طرح کی دلی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ (مقابلے کی یہ بلا مشرقی ملکوں میں بھی لوگوں کے سر پر سوار ہوتی چلی جارہی ہے) آج کل کی زندگی میں ترقی اسی کا نام ہے کہ موازنہ ہو مجادلہ ہو مقابلہ ہو۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی خواہش نے انسانی نفس کو اوندھے منہ گرا دیا ہے۔ ہر متمدن شخص کو یہی دُھن لگی ہے یہی گھن لگ چکا ہے کہ فلاں اور فلاں شخص مجھے مات نہ کر دے میں سوسائٹی کا سب سے روشن تارا ہو کر چمکوں۔ یہ جنون یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ مقابلہ کی عادت ایسی باتوں میں بھی اپنا رنگ دکھانے لگی ہے جن سے اُسے تعلق نہ ہونا چاہئے مثلاً کتابوں کا مطالعہ۔ کتاب پڑھنے کے آج کل دو مقصد ہوتے ہیں ایک اس سے لُطف اُٹھانا دوسرے اُس کے متعلق ڈینگ مارنا۔ کسی کتاب کو بعض لوگ تو ساری کی ساری پڑھتے ہیں بعض اس کا پہلا باب اور بعض فقط اُس کے متعلق تبصرے پڑھ لیتے ہیں لیکن یوں وہ ان سب کی میزوں پر برابر پڑی نظر آتی ہے۔ اس طرح کے پڑھنے والے عموماً علم ادب کے شاہکاروں سے واسطہ نہیں رکھتے بلکہ تازہ ترین تصنیفات کو جلد جلد اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ یہ ہے نتیجہ مقابلے کا اور کامران سمجھے جانے کے بے پناہ شوق کا۔ کامرانی بے شک زندگی کی مسرت کا ایک جزو ہے اور ایک نہایت اہم جزو لیکن دھیان رکھو کہ وُہ تمہارے اجزائے مسرت کا صرف ایک جزو ہو اور بس۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری کامرانی تمہارے نفس میں اپنی نکیل ڈال کر جدھر چاہے جہاں تک چاہے تمہیں گھسیٹتی پھرے۔ یہ خیال کہ زندگی محض ایک مقابلہ ہے انسانی پہلوانوں کا کشتی لڑنا اور ایک دوسرے کو پچھاڑنا ہے اور دُنیا محض حریفوں کی سابقت کا میدان ہے بلاشبہ ایک جنون ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے نفس میں قوتِ ارادی تو نشو و نما پاتی ہے لیکن حواس اور عقل کی بیخ کنی ہوتی ہے اور انسان قوت کو فہم پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ اس سے نہ صرف کام کے اوقات بلکہ آرام اور فرصت کی گھڑیاں بھی بے لُطف ہو جاتی ہیں اور نفس ایک نوع کی بے تابی سے مضطرب رہنے لگتا ہے۔ اس کا علاج فقط یہ ہے کہ کاروباری آدمی اپنے اصول و خیالات کو بدلے، متمدن انسان اپنے نصب العین میں ہر بات کے اعتدال سے تبدیلی پیدا کرے اور پھر آہستگی اور اطمینان کے ساتھ کاموں کا سرانجام دینا اور زندگی سے لُطف اندوز ہونا سیکھے۔

بیزاری اور ہنگامہ پسندی بھی متمدن انسان کی ناخوشی کے اسباب ہیں۔ بیزاری زراعت کے زمانے سے شروع ہوئی۔ جب انسان محض ایک شکاری تھا تو اُسے اپنے شکار کے لئے ہمہ وقت ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ جب وہ کسان بنا تو فراغت کے اوقات میں وہ پہلے پہل فرصت کی بیزاری سے دوچار ہوا مشینوں نے آکر اسی بیزاری کے احساس کو کم کیا ہے اگرچہ یہ درست ہے کہ حال کا متمدن آدمی اپنے بزرگوں کی بہ نسبت بیزاری سے زیادہ خائف ہے۔ پڑے پڑے یا اُٹھتے بیٹھتے انگڑائیاں لیتے رہنا گزرے وقتوں میں زیادہ دیکھنے میں آتا تھا آج کل تو بھاگ دوڑ اور ہنگامہ پسندی کا دور دورہ ہے۔

عقلمند آدمی کبھی ناقابلِ حصُول شے کی تلاش میں ہاتھ پاؤں نہیں مارتا۔

ناقابلِ حصول شے کے لئے آہیں نہ بھرو اور نہ بہت سی اشیاء کے لئے بے تاب رہو۔

عصبی ہنگامہ پسندی ایک حد تک لطف اندوزی کی معاون ہے۔ وہ انہماک کی نشانی ہے لیکن جہاں وہ ذرا حد سے بڑھی جان کا عذاب بن گئی۔ پھر شراب کی طرح اس کے سوا اطمینان نہیں۔ اس بے چینی کے بغیر چین کی صورت ممکن نہیں ہوتی۔ بیزاری بُری شے ہے لیکن اک ذرا سی بیزاری اتنی جتنی آٹے میں نمک زندگی کے لئے کارآمد ہے۔ غالباً بیزاری بھی زندگی کے مرکب کا ایک لاینفک جزو ہے اور جو شخص بیزاری کو مطلق برداشت نہیں کرسکتا وہ زندگی کی مسرتوں سے کماحقہ بہرہ اندوز بھی نہیں ہوسکتا۔ بیزاری کو برداشت کرسکنے کی عادت بچپن ہی میں ڈالنی چاہئے۔ بچے کو عموماً بے چین کرنے والی مصروفیتوں میں حصہ نہ لینے دینا چاہئے۔ زمین کے رہنے والوں کو زمین کی حرکت کی طرح زمین کے سکون سے بھی واسطہ ہے۔ ہم زندگی سے پوری طرح لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ جب تک ہم تحریک کے ساتھ تسکین کا سبق بھی نہ سیکھیں جب تک "جلد جلد" کے ساتھ "آہستہ آہستہ" سے بھی آشنا نہ ہو جائیں جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ سرما و خزاں بھی حیاتِ ارضی کے لئے اتنی ہی ضروری ہیں جتنی گرما و بہار۔

انسانی جسم و نفس بھی اس زمین ہی کی پیداوار ہیں اور اگر یہ زمینی خصوصیات سے قطعاً بے تعلق ہو جائیں گے تو یہ پوری طرح نشوونما نہ پاسکیں گے۔ ہمارا مصنف کہتا ہے کہ ایک دفعہ مجھے ایک ایسے دو سالہ بچے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جو شروع سے لندن ہی میں رکھا گیا تھا۔ جب اُسے پہلی بار ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کو لے گئے تو گو سردیوں کے دن تھے اور زمین بھیگی ہوئی تھی اور دیکھا جائے تو کوئی چیز ایسی نہ تھی جو ایک جوان آدمی کے لئے خوش ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن یہ دو سالہ بچہ خوشی سے بے تاب ہوا جاتا تھا۔ کبھی وہ گیلی زمین پر گھٹنے ٹیک کر گھاس میں منہ ڈالتا تھا اور کبھی وہ خوشی کے مارے بے تحاشا چیختا تھا۔ اُس کی خوشی ایک سادہ غیر متمدن آدمی کی فطری خوشی تھی، جس سے اکثر متمدن لوگ زمینی زندگی سے بے تعلق ہو جانے کے باعث محض بے بہرہ ہو چکے ہیں اور ایک نوع کی دلچسپ بے چینی کے خوگر ہو گئے ہیں۔ بہترین انسانی مساعی میں عموماً فطرت کی سادہ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اچھی سے اچھی کتابوں میں دلچسپ حصوں کے ساتھ سادہ اور غیر دلچسپ حصے بھی ہوتے ہیں۔ اور بڑے سے بڑے آدمیوں کی زندگی میں بجائے بے چینی کے چین اور اطمینان کا پرتو نظر آتا ہے۔ اسی لئے ایک مسرور زندگی کے لئے ایک مطمئن اور تسکین یافتہ نفس کا وجود لابدی ہے۔

تھکن ناخوشی کا ایک سبب ہے یعنی وہ اعصابی تھکن جو بالعموم متمدن انسانوں کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ شہروں کے اعصاب کُش شوروغل، اجنبیوں کی تکلیف دہ موجودگی عجلت جسم و جان کو تباہ کرنے والی آدابِ مجلس جن کے بار کے نیچے ہر وقت طبیعت دبی رہتی ہے خوف مالک کی ناراضی کا، تعطل کا، دیوالیہ ہو جانے کا، کوئی نہ کوئی فکر غریبوں اور متوسط درجے کے لوگوں کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کی، امیروں کو اپنا وقت کاٹنے کی یا اپنی غلطیاں اور بے اعتدالیاں چھپانے کی ان سب کا نتیجہ اعصابی تھکن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس کا عارضی علاج یا شراب خواری ہے یا کوئی اور ایسی ہی حیات کُش عادت۔ اکثر یہ تھکن فکر و تشویش کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ تشویش دُور ہوسکتی ہے اگر ہم اپنی زندگی کا ایک بہتر فلسفہ وضع کریں، اگر ہم اپنے خیالات پر زیادہ قابو رکھنا سیکھیں ہمیں چاہئے

عقلمندی سرگوشی کرتی ہے بیوقوفی شور مچادیتی ہے۔

کہ ہم کسی چیز کے متعلق ٹھیک وقت پر خیال کریں جب خیال کرنے کی ضرورت ہو اور اُس سے کچھ فائدہ۔ جن لوگوں کو اپنے خیالات پر پورا قابو حاصل نہیں وہ بے وقت غور وفکر کرتے رہتے ہیں، باتوں کو آنے والے واقعات کے خیال سے پڑے پڑے اپنے بستر میں کروٹیں لیتے ہیں اور مفت میں بے خوابی کا شکار ہوتے ہیں۔ اور بعض قسم کی فکریں تو محض اس ترکیب سے دُور ہو جاتی ہیں کہ ہم ذرا سوچیں کہ معاملات جن سے وہ پیدا ہوتی ہیں کس قدر غیر اہم ہیں۔ رسل کہتا ہے کہ پہلے پہل جب مجھے تقریر کرنی پڑتی تھی تو اس کا خیال مجھے گھنٹوں بے چین رکھتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میری ٹانگ ہی ٹوٹ جائے کہ میں اِس خوفناک امتحان سے رہائی پاؤں اور جب میں تقریر کر چکتا تھا تو میں اعصابی بار سے مضمحل ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ کچھ مضائقہ نہیں خواہ میں اچھی تقریر کروں یا بُری۔ کائنات بدستور سابق چلی چلے گی۔ میں نے دیکھا کہ میری اس بے پروائی سے میری تقریر میں روانی اور عمدگی پیدا ہوتی گئی اور اِس کے بعد اس سے میری طبیعت پر بہت کم بوجھ پڑتا تھا۔ انسان اپنے افعال اور دُنیا کے واقعات کو ضرورت سے زیادہ اہمیّت دے کر اپنے لئے انہیں ایک مصیبت بنا لیتا ہے۔ وُہ شخص جو ذاتی اُمور اور دُنیاوی حادثات سے بالا بالا رہتا ہے نشیب و فرازِ زمانہ سے محفوظ رہتا ہے۔ مصائب کے اوقات میں اُس کی وُہ ناگفتہ بہ حالت نہیں ہوتی جو ایک خود اندیش شخص کی ہوتی ہے۔ بقول رسل ہر اُس شخص کو جو اپنے کام کو بغایت ضروری سمجھے زبردستی چھٹی لینے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ دراصل ایسا شخص کسی جذباتی تکلیف سے بچنے کے لئے کام میں پناہ ڈھونڈتا ہے اُس کا مداوا کام نہیں بلکہ کام کے متعلق قدرے بے پروائی جس کے لئے ایسی حالت میں ضبطِ نفس کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضبطِ نفس سے تضییعِ خیالات میں کمی ہوتی ہے نیند بہتر آتی ہے توانائی بڑھتی ہے اور کام کی صلاحیت میں دن دونی ترقی ہوتی ہے۔ فکر و تشویش کا دوسرا علاج نفس کے غیر شعوری حصّے کی اصلاح ہے۔ بہت سے خیال جو شعوری نفس سے خارج کئے ہوتے ہیں غیر شعوری نفس میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور رہ رہ کر ہمیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔ عقلمند آدمی کو چاہیئے کہ وہ درست قسم کے خیالات کو بزور اپنے غیر شعوری نفس میں جگہ دے۔ رسل کہتا ہے کہ جب مجھے کسی ادق مضمون پر طبع آزمائی کرنی ہوتی ہے تو میں چند دنوں یا گھنٹوں اُس پر پُوری توجہ کے ساتھ غور کرتا ہُوں اور پھر گویا ہدایت کر دیتا ہوں کہ اب یہ کام اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد جب میں پھر اُس کام کو کرنے لگتا ہُوں تو میں دیکھتا ہوں کہ کام کا بہت سا حصہ گویا ہو چکا ہوتا ہے۔

تھکن اکثر کسی نہ کسی قسم کے خوف سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو دق کا خطرہ ہے کسی کو افلاس کا کسی کو کسی بھید کے کھُل جانے کا اسی طرح کسی کو شبہات کا گھُن لگا ہے اور کسی کو راتوں کے وقت دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ کا ڈر لگا رہتا ہے۔ لوگ عموماً اس قسم کے خوفوں سے بچنے کے لئے اپنے جی کو دوسرے خیالوں میں لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن خوف کے مرض کا یہ علاج مرض سے بدتر ہے۔ ہر خوف زیادہ خوفناک ہو جاتا ہے اگر انسان اُس سے خوف زدہ ہو کر اُس سے گریز کرے۔ خوف کے دُور کرنے کی ایک

زندگی ایک نازک سا رشتہ ہے۔ اُس کی اُلجھنوں کو احتیاط اور صبر اور باقاعدگی سے سُلجھاؤ۔

ہی ترکیب ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور بات کو خوب سمجھو یہاں تک کہ تم پر اُس کے تمام پہلو روشن ہو جائیں۔ اِس طرح معاملۂ زیرِ غور سے پوری واقفیت حاصل ہو کر اُس کا ہَول جاتا رہے گا اور نفس اُس پر غالب پالے گا + اگر نوجوانوں کو شروع سے بے باکی کی تعلیم دی جائے، اُن کی دلیری کو سراہا جائے، رائے عامہ کی طرف سے اُن کی بے پروائی کو مذموم نہ قرار دیا جائے تو نوعِ انسان کے فکر و تشویش گھٹ کر آدھے رہ جائیں + تھکن کا ایک اور سبب بے چین کرنے والی تفریحات کا شوق ہے + کام کرنے والا کام سے واپس آتا ہے اور پھر کسی ایسی تفریح میں مصروف ہو جاتا ہے جو کام ہی کی طرح تھکانے والی ثابت ہوتی ہے + رسل سے آزاد خیالوں کا نظریہ ہے کہ اگر اخلاقِ عامہ میں مردوں عورتوں کے آزاد اختلاط کو اِس قدر غیر پسندیدہ نہ سمجھا جائے تو لوگوں کو تفریح کا ایک آسان اور فطری ذریعہ میسّر ہو جائے +

اعصابی تھکن ایک پردہ ہے جو انسان اور دُنیا کے درمیان حائل ہو جاتا ہے + محسوسات براہِ راست اُس تک نہیں پہنچتے اور اُس کی توجہ صرف چند اشیاء کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ بے چینی اور تھکن ہوتا ہے۔ یہ ہے سزا فطرت سے بے تعلق ہو جانے کی پس اگر تم زندگی سے متمتع ہونا چاہتے ہو تو ایک فطری زندگی بسر کرنا شروع کرو +

حسد انسانی جذبات میں ایک نہایت راسخ جذبہ ہے بچوں میں، نوکروں میں، صاحبِ اقتدار آدمیوں میں، شریف متمول خواتین میں، ہم پیشہ مردوں میں یہ جذبہ ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے۔ جہاں بچہ ایک برس کا ہوا اور اُس نے دیکھا کہ تم نے دوسرے بچے کو زیادہ پیار کیا کہ وہیں اُس کے دل میں حسد پیدا ہو گیا۔ عورتوں میں حسد اور غیبت کی عادت کس کثرت سے پائی جاتی ہے شرفا کے کسی مجمع میں دیکھو کہ ایک عورت زرق برق لباس پہنے ہو تو کتنی عورتیں جل بھن کر کوئلہ ہوئی جاتی ہیں (مشاعروں میں شاعروں کے مقابلے مشہور ہیں، ذوق غالب کے سہرے اسی ضمن میں منظرِ عام پر آئے) حسد خاص طور پر جمہوری حکومتوں میں پایا جاتا ہے انسانوں کی برابری ایک نہایت بلند و پاکیزہ نظریہ ہے لیکن اسی سے حسد و مسابقت کا بازار گرم ہوتا ہے + حسد کی بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ خود حاسد کو بے حد نقصان پہنچاتا ہے۔ حاسد حسد سے جلا مرتا ہے۔ مثلاً میں ایک دستکار ہوں اور دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر اور وکیل اپنی اپنی کاروں میں اپنے کام پر جاتے ہیں اور مجھے پیدل جانا پڑتا ہے سو میں ان سے حسد کرتا ہوں اور اپنی تھکن میں اور زیادہ تھک جاتا ہوں۔

فلاں شخص کے پاس فلاں شے ہے میرے پاس کیوں نہیں؟ اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ حسد کا ایک ہی کارگر علاج ہے کہ ہم نوعِ انسان میں تعریف و تحسین کی عادت کو بڑھائیں اور حسد کو گھٹائیں + کوئی زاہد یا ولی ایثار و بے غرضی سے شاید حسد سے پاک ہو جائے تو ہو جائے لیکن عام مردوں عورتوں کے لئے حسد کا ستباب صرف خوشی کے حصول سے ہو سکتا ہے + حسد بچپن میں غلط تربیت سے پیدا ہوتا ہے۔ جس بچے کے سامنے اُس کے بہن بھائی کو ترجیح دی جائے یا جو بچہ دیکھے کہ اُس کے والدین اُس سے اتنی شفقت کا سلوک نہیں کرتے جتنے اور بچوں کے والدین، وہ بچہ یقینی طور پر حاسد بن جائے گا + ایک حاسد شخص ہم سے کہے گا کہ تم وعظ کر رہے ہو کہ حسد خوشی سے مٹتا ہے لیکن مجھے تو یہ مصیبت پڑی ہے کہ جب تک حسد میرے دل میں جاگزیں ہے خوشی وہاں داخل نہیں ہو سکتی میں تمہاری نصیحتوں پر کیسے عمل کروں۔ آج موسم خوب ہے سُورج چمک رہا ہے ہوا چل رہی ہے مگر میں سنتا ہوں کہ فرانس میں یا کشمیر میں جنت کی سی

بہار ہے۔ میری معشوقہ خوبصورت ہے اور باوفا مگر کاش وہ لیلیٰ یا شیریں کی سی ہوتی تو میں اپنی ساری زندگی اُس پر قربان کر دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم اس بات کو خوب ذہن نشیں کرلیں کہ ہماری ناخوشی کا کیا سبب ہے تو ہمارے لئے اُس کا انسداد آسان ہو جاتا ہے۔ نفسی انضباط جس سے انسان فضول خیالات کو بے وقت نہیں سوچتا ازبس ضروری ہے۔ آخر ایک حاسد کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ میں جو کسی پر حسد کر کرکے مر رہا ہوں اگر اپنی ہی خوشی سے خوش ہو جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔ خوشی سے زیادہ قابلِ رشک اور کون سی شے ہے۔ اگر میں خوش ہو جاؤں اور خوش رہوں تو وہی لوگ جن پر اب مجھے حسد آتا ہے پھر مجھ پر حسد کرنے لگیں۔ تم اگر عالمگیر شہرت کے تمنائی ہو تو ممکن ہے تم نپولین سے حسد کرنے لگو۔ لیکن غریب نپولین سیزر سے حسد رکھتا تھا اور سیزر کا دل سکندرِ اعظم کے کارناموں سے جلتا تھا اور سکندر ممکن ہے ہرقل پر جو ایک فرضی شخص تھا رشک کرتا ہو۔ پس حسد سے کامیابی کے ذریعے سے بچ نکلنا ممکن نہیں۔ حسد کا انسداد صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو خوشیاں تمہارے نصیب میں ہوں اُن سے لُطف اٹھاؤ، جو کام تمہیں کرنے ہیں کرو اور دوسروں سے بے فائدہ مقابلہ کرنا چھوڑ دو۔

حسد کا ایک باعث انکسار بھی ہے (انکسار مشرق میں قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے لیکن حال کے مغربی مفکرین عموماً اسے لائق تحسین نہیں سمجھتے) منکسر المزاج آدمی خیال کرتا ہے کہ اُس کے ساتھی اُس سے بڑھ گئے ہیں اس لئے اُس کے دل میں حسد اور بھی جلد پیدا ہوتا ہے۔ رسل کہتا ہے کہ اپنے لڑکے کو یہ سکھاؤ کہ وہ اپنے آپ کو ایک اچھا اور ہوشیار لڑکا سمجھے۔ کوئی مور دوسرے مور کے پروں سے حسد نہیں رکھتا کیونکہ ہر مور کو اس کا یقین ہے کہ میرے پر دنیا میں سب سے خوبصورت ہیں۔ اسی لئے مور امن پسند جانور ہے۔ اگر کسی مور کو یہ سکھایا جائے کہ تم اپنے پروں کو بہترین پر نہ سمجھا کرو تو نتیجہ یہ ہو کہ جب کبھی وہ کسی اور مور کو ناچتے دیکھے تو وہ جی میں یوں خیال کرے کہ "مجھے ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ میرے پر اس سے بہتر ہیں کیونکہ یہ ہوگا تکبر لیکن آہ کاش کہ میرے پر بھی ایسے ہی خوبصورت ہوتے۔ ذرا دیکھو یہ کم بخت جانور پھولا نہیں سماتا۔ میں اس کے کچھ پر نوچ نہ ڈالوں؟ پھر مقابلے کی بلا میرے سر پر سوار نہ رہے" یا شاید "نیک" مور خوبصورت مور کے لئے ایک جال پھیلائے اور ثابت کرے کہ خوبصورت مور کمینہ ہے اور موروں کے اخلاق کا پابند نہیں اور یوں وہ اُسے موروں کی محفل میں بدنام کرے یہاں تک کہ یہ امر مسلمہ سمجھا جائے کہ پروں والے مور بدتمیز ہوتے ہیں اور موروں کے راجہ کو چاہئے کہ وہ تمام ایسے موروں کے پر نچوا ڈالے اور انہیں مروا ڈالے۔ اس ساری "نیک نفسی" کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوبصورت پروں والے مور تقریباً ناپید ہو جائیں گے اور صرف دُم کٹے مور بھاگتے دوڑتے نظر آئیں گے۔ یہ ہے حسد کی فتح اور اُس کا انجام۔

زمانۂ حال کی پُرمقابلہ جمہوری زندگی حسد کی ذمہ دار ہے۔ تھکن سے بھی حسد بڑھتا ہے۔ تھکا ماندہ آدمی جب اپنا کام بخوبی

خلوص کا یہ مُدعا نہیں کہ تم دُوسروں کی پسند و رجحان کو بُرا سمجھو اور بُرا کہو بلکہ اُس کا یہ تقاضا ہے کہ تم اپنے رجحان و پسند کا دلیری کے ساتھ اظہار کیا کرو۔

ہر شخص میں بے غرضی اور نیکی کی ممکنات موجود ہیں۔

سرانجام نہیں دے سکتا تو اُس کے دل میں ایک عام بیزاری سی پیدا ہوتی ہے اور یہ چپکے چپکے حسد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حسد کی بلا بڑی حد تک دُور ہو جائے اگر نوعِ انسان کی زندگی اُس کی جبلت کے زیادہ مطابق گزاری جا سکے چنانچہ جنسی اشتہا سے حسد پیدا ہوتا ہے اور جو شخص اپنی بیوی اور بال بچوں میں خوش ہے اُسے حسد کا مرض بہت کم لاحق ہوتا ہے۔ انسانی خوشی کی ضروریات نہایت سادہ اور سہل الحصول ہیں جو جذبات فطرت نے انسانی نفس میں رکھے ہیں اگر اُن کی ایک حد تک تسلی ہوتی رہے تو انسان بغیر دقت کے خوش اور مطمئن رہ سکتا ہے۔ حال کے تمدن کی بدبختی ہے کہ متمدن آدمی بجائے دوستی کا جذبہ محسوس کرنے کے رقابت اور دشمنی کا جذبہ زیادہ محسوس کرتا ہے اور یہ اِس لئے کہ اُس کا دل بے تاب رہتا ہے، وہ دل کے اندر ہی اندر محسوس کرتا ہے کہ وہ زندگی کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکا اور اِس لئے کچھ اُداس سا ہو جاتا ہے، کچھ اس طرح جیسے چڑیا گھر میں لنگور ہمیں دیکھ کر اور شاید یہ خیال کر کے کہ کاش ہم بھی انسان ہوتے لیکن انہیں پتہ نہیں چلتا کہ انسان کس طرح بنیں۔ یہی حال متمدن آدمی کا ہے۔ ارتقا کی منزل میں متمدن آدمی کھویا سا گیا ہے۔ ہم آج کل ایک ایسے مرحلۂ تمدن میں ہیں جس سے ہمیں جلد گزر جانا چاہئے۔ متمدن انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دل کو وسعت دے جیسے اُس نے اپنے نفس کو وسعت دی ہے اور نری خودی سے بلند تر ہونا سیکھے تاکہ وہ کائنات کی صحیح آزادی کا اہل ہو سکے۔

گناہ احساسی بھی ناخوشی کا منبع ہے۔ حال کے مغربی ماہرینِ علم النفس گناہ احساسی کو مذہب سے منسوب کرتے ہیں کہ مذہب نے آکر انسان میں ضمیر کا خیال پیدا کیا۔ اُن کے نزدیک ضمیر بعض وقت محض بھید کُھل جانے کے ڈر کا نام ہے، بعض وقت برادری سے خارج ہو جانے کے ڈر کا، بعض وقت محض اُن غلط اجتنابی خیالات کا جو ایک غلط پاکبازی نے مُدتوں سے نوعِ انسان کے دل میں ٹھونسے ہیں۔ ہم بچپن میں اپنے ماں باپ سے سُنتے ہیں کہ قسم کھانا گناہ ہے، بعض اعضاءِ جسمانی کا ذکر گناہ ہے، بعض فطری رجحانات گناہ ہیں، تمباکو نوشی گناہ ہے، مرد کے لئے عورت کی خواہش عورت کے لئے مرد کی طرف میلان گناہ ہے یہ گناہ ہے وہ گناہ ہے، غرض انسان کا سارا ماحول گناہ کی نجاست سے غلیظ ہو جاتا ہے وہ گناہ ہی گناہ دیکھتا ہے گناہ ہی گناہ کا خیال کرتا ہے اور گناہ ہی گناہ کا احساس کرتا ہے۔ یہ سب غلط اور محض غلط ہے اُس کا لازمی نتیجہ خوشیوں کا بے مزہ ہو جانا اور زندگی کا ناخوش اور کمزور ہو جانا ہے اور کچھ نہیں۔ فی الحقیقت نیک آدمی وہ ہے جو کسی شے سے لطف اُٹھانے کو بُرا نہ سمجھے جب تک اِس لطف اندوزی کا نتیجہ صریح طور پر نقصان دہ نہ ہو۔ رسل کہتا ہے جھوٹ بولنا عموماً ایک نہایت بُری بات ہے لیکن میں یہ نہ مانوں گا کہ جھوٹ بولنا ہمیشہ ہر حال میں بُرا ہے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں کھیتوں میں ٹہلنے کو نکل گیا۔ کچھ شکاری لوگ اپنے کتوں کو لئے ہوئے ایک غریب لومڑی کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ جان بچائے آگے آگے دوڑی جاتی تھی یہ پیچھے پیچھے مار دھاڑ کرتے چلے آتے تھے کہ اتنے میں وہ اُن کی نظروں

انسانی تجربے سے عام طور پر ثابت ہے کہ نیک ہونا خوش ہونا ہے۔

حد سے بڑھی ہوئی نیکی گستاخ اور بے لحاظ ہوتی ہے۔ ایک تنگ کرنے والے ملاقاتی سے کہلوانا کہ وہ گھر میں نہیں" یا کہنا کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" یہ کوئی برائی نہیں۔

ہشو۔ آدل

سے اوجھل ہو کر کسی طرف کو چل دی۔ مجھ سے آکر انہوں نے پوچھا کہ وہ کدھر گئی مجھے معلوم تھا لیکن میں نے سچ کو چھپایا اور میں نہیں سمجھتا کہ اگر میں سچ بول دیتا تو اس سے کیونکر میں ایک زیادہ نیک آدمی بن جاتا۔ جنسیت کے معاملے میں جدید مفکرین کے خیالات خاص طور پر قابل غور ہیں کیونکہ وہ ہمارے خیالات سے بلغایت مختلف بلکہ اُن کے عین متضاد ہیں)۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت مرد کے باہمی تعلقات کو مذموم سمجھا جاتا ہے حالانکہ اگر انسان اعتدال پر قائم رہے تو وہ اُس کے لئے بالکل فطری چیز ہیں+ ایک غلط قسم کی حیاداری اور پاکبازی نے اس مسرت کو مکدر کر دیا ہے اور اُسے گناہ اور غلاظت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بچے کو ان پرانے خیالات سے بچانا چاہئے اور بڑوں کو جن کے دل میں یہ خیالات مدت سے بیٹھ گئے ہیں اپنے غیر شعوری نفس کو اس زہر سے پاک و صاف کرنا چاہئے۔ متمدن آدمی کو چاہئے کہ وہ تلون مزاج کا شکار نہ ہوتا رہے کہ کبھی کچھ خیال کرے کبھی کچھ بلکہ جس نئی بات کو اُس کی عقل مان لے اُسے بزور اپنے نفس میں جگہ دے+ گناہ کا احساس تھکن یا علالت کے وقتوں میں خاص طور پر زور پکڑتا ہے لیکن اگر انسان کے نفس شاعرہ میں خیالات پوری طرح راسخ کئے جائیں اور وہ گھڑی کے لنگر کی طرح اِدھر سے اُدھر گردش نہ کرتا رہے تو پرانی عادات و خیالات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا کوئی مشکل کام نہیں+ اپنی قوتِ ارادی کو مضبوط بناؤ۔[1] دعلمی یقین نہ ہو کہ کبھی عقل کے پیچھے ہو لو اور کبھی توہمات کے پیچھے دوڑتے پھرو۔ بزرگوں کے قول و عمل کی پیروی محض اس لئے کہ وہ تمہارے بزرگوں کے قول و عمل ہیں جہالت ہے۔ خود غور کرو کہ واقعی بُرے فعل کون سے ہیں۔ کاروبار میں چالاکی، اپنے ملازمین سے درشتی کا سلوک، بیوی اور بچوں پر ظلم، اپنے ہم پیشہ لوگوں سے دشمنی، سیاسی مقابلوں میں ایک نوع کی خونخواری، یہ ہیں واقعی بُرے فعل جن کی قانون میں سزا نہیں لیکن جن سے نوع انسان تباہ حال و برباد ہو رہی ہے+ جو کچھ تمہاری عقل کہے جو کچھ تم غور و خوض کے بعد سمجھو اُسے انتہائی احتیاط کے ساتھ محسوس کر دائمی کو سچ جانو اور سچ مانو اور اُسی پر مسلسل طور سے عمل پیرا ہوتے رہو+ جب کبھی تم سے ایسی غلطی یا گناہ سرزد ہو جسے تم خود بھی غلطی یا گناہ سمجھتے ہو اُس حالت میں بھی گناہ احساسی تمہاری ترقی یا بہبود کا ذریعہ نہیں بن سکتی کیونکہ گناہ احساسی خودداری کے خلاف ہے اور خودداری گئی تو سمجھ لو کہ بہت کچھ جاتا رہا+ گناہ احساسی سے آدمی کو ناخوشی اور ہیچ میرزی کا احساس ہونے لگتا ہے اور پھر ناخوش ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں سے بڑی بڑی توقعات رکھتا ہے اور زیادہ ہی زیادہ ناخوش ہوتا جاتا ہے۔ ہیچ میرزی کے احساس سے وہ دل ہی دل میں ان لوگوں کی بڑائی پر پیچ و تاب کھاتا ہے جو اُس سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں اور دوسروں کی تحسین کرنا اُس کے لئے مشکل اور حسد کرنا آسان ہو جاتا ہے+ دوسروں کی طرف ایک وسیع اور فیاضانہ رویہ نہ صرف دوسروں کے لئے خوشی کا موجب ہوتا ہے بلکہ انسان کے اپنے لئے سچی خوشی کا سبب بن جاتا ہے لیکن ایسا رویہ صرف قلبی توازن اور خود اعتمادی سے پیدا ہوتا ہے صرف اُس ذہنی

صرف امرِ واقع کو مانو اور گمان و وہم سے یکسر منہ پھیر لو+

ایک بار کوئی بے معنی کام کر دیا کوئی بے معنی سی بات مان لو تو اُس سے تمہاری ساری عمر پر بُرا اثر پڑے گا

مسلسل ہیچ میرزی ایک قسم کا غرورِ معکوس ہے+

ترتیب و ترکیب سے جو شعوری نیم شعوری اور غیر شعوری نفس تینوں کے مکمل اتحاد سے ظہور میں آسکتی ہے + ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو نفسی تخریب سے روکے جو ایک نوع کی خانہ جنگی ہے، نفس کے اندر ہی اندر۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ اپنا امتحان لیا کرے کہ اس سے محض خود اندیشی میں اضافہ ہوگا بلکہ بہترین طریقہ یہی ہے کہ انسان عزمِ مصمم کرلے کہ اُس کے لئے عقلاً کونسی بات صحیح ہے اور کون سی لغو اور اِس کے بعد وہ اپنے نامعقول اعتقادات و توہمات کی یکسر بیخ کنی کردے + بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ عقل کی زیادہ پیروی اچھی نہیں، اِس سے اچھے جذبات کا قلع قمع ہوتا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نفرت یا حسد یا ایسے ہی مذموم جذبات کی سرکوبی سے زندگی غیر دلچسپ ہوجائے بشرطیکہ انسان عقل کے ساتھ ساتھ اپنی جبلت پر بھی نظر رکھے اور اپنی جائز فطری ضروریات کو پورا کرتا رہے + بلاشبہ اس قسم کی جبلت آشنا عقلیت زندگی کو بہتر اور خوش تر بنائے گی اور جو شخص نفس کی پُرانی بیماریوں کا عقل کے ذریعے سے علاج کرنے کی طرف متوجہ ہوگا وہ یقیناً ایک ایسے شخص سے بھی زیادہ صحت مند ہوجائے گا جسے ان بیماریوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا + عقل اور غور و خوض کے استعمال سے کبھی کوئی شخص زیادہ ناخوش نہیں ہوتا۔ کیونکہ خوشی اُسی وقت مکمل ہوتی ہے جب انسان کے سب قوا پوری طرح کام کریں اور جب نفس ہمہ تن مصروف ہو اور کوئی شے بھی بھولی ہوئی نہ ہو۔ وہ خوشی جو کسی نشے کی محتاج ہو کبھی پوری تسلی نہیں دے سکتی بلکہ وہی خوشی پوری تسلی دے گی جو ہمارے قوا کے پورے استعمال اور دنیا و مافیہا کی پوری واقفیت کے ساتھ حاصل ہو +

بعض لوگوں کو یہ خبط ہوتا ہے کہ ساری دُنیا ہماری ہی ایذا رسانی پر تُلی ہوئی ہے + یہ ایذا رسانی کا خبط ایک نوع کا مرض ہے جس کی انتہائی شکل دیوانگی ہے + بعض اشخاص ہمارے پاس ہمیشہ اپنی شکایتوں کا چھٹا لے کر آتے ہیں فلاں ہم سے حسد رکھتا ہے فلاں کا سر آسمان پر ہے فلاں نے مجھے دھوکا دیا فلاں نے بے وفائی کی فلاں نے بے اعتنائی کی + دُنیا کی رنگا رنگ زندگی میں حسد اور غرور اور جفا کی بے انتہا مثالیں ہیں اور بے شمار مواقع۔ لیکن ایک شخص جب یہی کہے اور سمجھے کہ اُس کے ساتھ ساری دُنیا نے صرف بُرائی کی تو ہمیں شبہ ہونے لگتا ہے کہ قصور اُس شخص کے نفس بلکہ دماغ میں ہو باقی اہلِ دُنیا میں نہیں۔ اِس مرض کا مداوا زیادہ مشکل اِس لئے ہے کہ یہ اگر ایک طرف زیادہ اظہارِ ہمدردی سے بڑھتا ہے تو دوسری طرف ناہمدردی سے بھی اس کا زور کم نہیں ہوتا۔ غیبت اِسی نوع کے خیالوں سے پیدا ہوتی ہے ہر شخص اپنی چُغلی کا حال سُن کر غصے میں آجاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اُس نے بھی کبھی نہ کبھی بالکل اِسی طرح دوسروں کی بُرائی کی ہے اور اِس سے لطف اُٹھایا ہے +

مشق جس قدر حصُول کے لئے ضروری ہے اتنی ہی لطف اندوزی کے لئے بھی ضروری ہے +

خوشی صرف مکمل تسکینِ ذات سے حاصل ہوسکتی ہے اور تسکین ذات ہزاروں لاکھوں کے اژدحام میں بھی صرف اپنی رُوحانی آزادی کے برقرار رکھنے سے ممکن ہے + ایمرسن کا قول ہے کہ نقل خودکشی ہے +

روزمرہ کی اصلی زندگی فرضی قصے کہانیوں سے کہیں زیادہ دلچسپ و دل آویز ہے +

خوشی شخصیت کے نشو و نما اور ذاتی قوا کے مکمل استعمال سے حاصل ہوتی ہے +

ایذارسانی کے مرض کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی خوبیوں کے تصور میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اصلیت سے زیادہ نیک یا زیادہ قابل یا زیادہ بہادر سمجھتے ہیں + ایک مصنف کو یقین ہے کہ وہ بہترین لکھنے والا ہے لیکن جب اُس کی تصنیف کو کوئی ناشر دس ہزار روپے میں خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتا تو اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ دُنیا ناقدردان ہے حاسد ہے بے سمجھ ہے۔ ایک مخیّر ہزاروں آدمیوں پر بے مانگے روز و شب خیرات نچھاور کرتا ہے اور جب اِس پر بھی ناقدر شناسی اور نا احسان مندی پاتا ہے تو اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کارِ خیر میں اُس کی نیت کیا ہے۔ ایک شخص دوسروں کا بھلا چاہتا ہے دوسروں کو کسی بُرے کام سے روکتا ہے، وہ یہ نہیں سمجھتا کہ عموماً دوسروں کو ایک شخص اُن کے بُرے کاموں سے اس لئے روکتا ہے کہ وہ خود ایسے کاموں کے لُطف سے محروم ہے۔ ملازموں اور مفلسوں کو ہم اکثر بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور اپنی بُری باتوں کو یاد نہیں کرتے۔ ایک سیاست دان یا خادمِ قوم جو برسوں کی محنت و توجہ سے عزت و طاقت کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہُوا ہے جب دیکھتا ہے کہ دُنیا اُس پر نکتہ چینی کرتی ہے اور شکرگزار نہیں تو وہ غم و غصے سے بے تاب ہو جاتا ہے وہ اتنا نہیں سمجھتا کہ ممکن ہے اس کی نیت محض خدمتِ قوم کی نہ ہو بلکہ خود نمائی اور ہوس اور طاقت اُس کی رہنما و معاون ہوں یا محض سب سے بڑا بننے کی خواہش نے اُسے سب سے بڑا بننے پر آمادہ کیا ہو + برسوں کی محنت کے بعد وہ عوام الناس سے بیزار ہو کر علیحدگی اختیار کر لیتا ہے اور افسوس ظاہر کرتا ہے کہ میں نے کیوں تمام عمر ناحق سرمغزن کی اور یہ معاوضہ پایا۔ ایذارسانی کا یہ خبط ذیل کی چار باتوں کے سمجھنے سے کم ہو سکتا ہے اول یاد رکھو کہ تمہاری نیت عموماً اتنی صاف نہیں ہوتی جتنی تم سمجھتے ہو۔ انسان کوئی فرشتہ نہیں وہ ایک خودغرض وجود ہے اور خودغرضی ایک حد تک بُرا وصف بھی نہیں بلکہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص تمام وقت محض دوسروں کو کھلانے پلانے میں مصروف رہے تو خود بھوک سے مر جائے گا اور ظاہر ہے کہ اِس طرح مر جانا کوئی تعریف کی بات نہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ انہماک کے بغیر کوئی بڑا کام سرانجام نہیں ہو سکتا اور بغیر تھوڑی سی خودغرضی کے انہماک ناممکن ہے۔ دوم اپنی خوبیوں پر اتنے حاشیے نہ چڑھاؤ بلکہ جان لو کہ اگر تم میں کوئی غیر معمولی خوبی موجود ہے تو اس کی قدر ہو کے رہے گی۔ تمہاری خوبی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ تم اپنے آپ سے سوال کرو کہ جو کچھ میں کرتا ہوں یا بناتا ہوں یا لکھتا ہوں وہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ میں اسے کرنے پر مجبور ہوں یا محض اِس لئے کہ دنیا میرے کام کی داد دے۔ داد کی یہ خواہش ایک واقعی بڑے آدمی میں بھی ہوتی ہے لیکن کم + سوم۔ دوسروں سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ بھی تمہاری زندگی میں اتنی ہی دلچسپی لیں جتنی تم خود لیتے ہو۔ بعض والدین اپنے بچوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنی جوانی ان کے بڑھاپے کے لئے وقف کر دیں یا اپنے خیالات کو اُن کی خاطر ترک کر دیں۔ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی زندگی کو اُس کی اختیار کردہ یا فطری راہ سے ہٹا کر اپنی راہ پر لگا لے۔ چہارم۔ یہ خیال نہ کرو کہ لوگوں کو تمہارا اس قدر خیال لگا رہتا

اپنی کمیوں کی پہچان اتنی ہی ضروری ہے جتنی اپنی خوبیوں کا احساس۔

اگر ہر شخص اپنے آپ کو صحیح طور پر جانچے اور اپنے نفس کو روکے تو تیس برس کے عرصے میں نوعِ انسان کہیں سے کہیں ترقی کر جائے۔

ہے کہ وہ تمام وقت تمہاری ایذارسانی کے درپے ہیں۔ اگر تم کوئی بڑے آدمی ہوتے (مثلاً لینن یا گاندھی) اور ہزاروں لاکھوں آدمی تمہاری برائیاں کرتے اور تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے رہتے تو یہ بات کچھ مانی جاسکتی تھی لیکن جب تم کروڑوں میں سے ایک عام انسان ہو تو اس وہم و خیال کو دل سے نکال دو کہ کل جن لوگوں نے پبلک میں تقریریں کیں اور اُن میں سے بعض کی تصویریں اخباروں میں شائع ہوئیں اور تمہاری شائع نہ ہوئی تو وجہ یہی تھی کہ لوگ تمہاری برائی سے جل گئے۔ اپنے آپ کو اس طرح بڑا بنانا اور بڑا سمجھنا چھوڑ دو کہ اس سے تمہاری خوشی نہیں بلکہ ناخوشی میں اضافہ ہوگا۔ کسی قسم کی تسکین دہی یا یقین یا وہم یا خیال جو خود بینی پر مبنی ہو پائدار نہیں ہوتا اور نہ مسرت آفریں ہوسکتا ہے۔ پس بہتر ہے کہ جس قدر جلد ہوسکے تم حق بات کو جان لو اور مان لو اور جس قدر جلد ممکن ہو تم اپنی زندگی کو اس اعتراف کی پختہ بنیاد پر تعمیر کرنا شروع کردو۔

رائے عامہ کا ڈر متمدن انسان کے لئے بھوت پریت کے ڈر سے کچھ کم نہیں۔ اکثر لوگ خوش نہیں رہ سکتے جب تک اُن کی طرز زندگی اور طرز خیال کو اُن کی معاشرہ یا اُن کے میل جول کے لوگ درست نہ سمجھیں۔ موجودہ زمانے میں آزادی کی وجہ سے آرا کا اختلاف عام ہوگیا ہے اور زیادہ عام ہوا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سوائے چند افراد کے بہت کم ہیں جو لوگوں کے اختلاف اور نکتہ چینی کو آسانی سے برداشت کرسکیں۔ اسی لئے آج کل کے اکثر نوجوان مرد اور عورتیں جن کے خیالات میں حریت اور مساوات کی بجلی دوڑ گئی ہے اپنی نوجوانی کے زمانے میں نہایت ناخوش اور مشوش رہتے ہیں۔ جب یہ لوگ کسی کالج یا دارالعلوم میں چند برس کے لئے جاتے ہیں تو انہیں بعض ہم خیال مل جاتے ہیں لیکن دنیا میں واپس آکر یہ پھر ویسے کے ویسے مصیبت زدہ ہوجاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ماسوا اُن کے جن کی سیرت غایت درجہ مضبوط و مستحکم ہو باقی سب بے انتہا کرب و اندوہ میں زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ کئی اشخاص رائے عامہ سے ضرورت سے زیادہ ڈرتے رہتے ہیں۔ رائے عامہ ایسے لوگوں پر جو اس سے ڈریں زیادہ ستم ڈھاتی ہے بہ نسبت اُن لوگوں کے جو اس سے بے پروا ہیں۔ اگر تم رائے عامہ سے اختلاف رکھتے ہو تو یہ اختلاف خوش مزاجی اور سنجرے پن کے ساتھ کرو یہاں تک کہ تم ایک ہر دلعزیز خبطی کا درجہ حاصل کرلو جو نہ کسی سے لڑتے جھگڑتے اور نہ اپنی ہی بات سے ہٹتے۔ یہ ظاہر نہ کرو کہ تم لوگوں کے قول و فعل کے خدائی نقاد ہو۔ لوگ اُن شخصوں کی آرا کو زیادہ برا نہیں مانتے جن کے مذاق اور دوست داری سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی نکتہ چینی کے اجارہ دار نہیں لیکن جہاں ذوق و رائے کے اختلاف کی وجہ سے ناہمدردی اپنا کام کرنے لگے وہاں اکثر ایسا کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ پھر بائیکاٹ شروع ہوتی ہے

جو شے ایک بڑے آدمی کے لئے اچھی ہے ضروری نہیں کہ وہ ایک چھوٹے آدمی کے لئے بھی اچھی ہو اور جو کچھ بڑے بڑے واقعات میں ضروری ہے ضرور نہیں کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں بھی ضروری ہو۔

اپنے اصول پر قائم رہنے میں کسی قسم کی درشتی کی ضرورت نہیں مسکرا کر کہی ہوئی "نہیں" اُتنی ہی پُر اثر ہوسکتی ہے جتنی منہ بنا کر کہی ہوئی "نہیں"۔

لوگوں کو خواہ مخواہ تنگ کرنے والی بہادریاں دکھانا پاگل پن کی نشانیاں ہیں۔

ہر شے کا ایک وقت ہوتا ہے اور موقع۔

یا اندر ہی اندر ایک جلن اور غصہ۔ لہٰذا جہاں بھی ممکن ہو ایسے نوجوانوں کو جو اپنے ماحول میں ناخوش ہوں اس قسم کے پیشے یا کام اختیار کرنے چاہئیں جہاں انہیں ہم خیالی کی نعمت دستیاب ہوسکے گو اس میں اُن کے لئے مادی خسارہ ہی کیوں نہ ہو۔ دنیا کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر نوجوان اس بات کو نہیں سمجھتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ برسوں ناخوش رہتے ہیں اور آخر کار مُدت کے بعد اگر حُسنِ اتفاق سے یا کوشش کے بعد انہیں اپنے کام کے لئے ایک بہتر ماحول حاصل ہو جائے تو اُن کی توانائی اس قدر کم اور اُن کا دل اس قدر بیزار ہو چکا ہوتا ہے کہ اُن کے لئے خوش ہوسکنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے نوجوانوں کو اُن کے اپنے انتخاب پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر وہ غلطی کرنے لگیں تو معمولی انتباہ کے بعد انہیں غلطی کرنے دینی چاہئے کہ وہ کبھی نہ کبھی خود بخود سیدھی راہ پر آجائیں گے۔ اگر تمہارا لڑکا تھیٹر میں ایکٹر بننا چاہے تو اُسے بننے دو تمہیں اُس کا ایکٹر بننا بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن کیا عجب ہے کہ وہ ایکٹروں میں ایک ایسا ایکٹر بن جائے جو تھیٹروں کی دُنیا میں ایک انقلاب پیدا کردے اور معاشرہ کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔

دُنیا میں عام طور پر دوسروں کی رائے کے بُت کی ضرورت سے زیادہ پرستش کی جاتی ہے۔ پیشے کا انتخاب، روپے کا صرف کرنا، تفریحات ان سب میں ہم اکثر دوسرے لوگوں کی رائے پر چلتے ہیں حالانکہ اگر ہم اپنی رائے پر چلیں اور لوگوں سے بغیر بحث مباحثہ کئے اُن کی راؤں سے بے پرواہی برتیں یعنی اپنی فطرت کے تقاضا کو پورا کریں اور دوسروں کے ساتھ اکھڑپن کا برتاؤ نہ کریں تو دُنیا اور خود ہمارا دائرہ معاشرت ہمیں زیادہ دلچسپ اور ہمدرد نظر آنے لگے اور دوسروں کی زندگی بھی ہمارے اس رویے سے زیادہ مسرور و پُر لُطف ہو جائے۔ موجودہ دنیا میں بوجہ نقل و حرکت کی آسانی کے نزدیکی ہمسایوں کی مصاحبت سے نجات مل سکتی ہے اور اس لئے ایک سمجھ دار شخص زیادہ آسانی کے ساتھ اپنے ہم خیال و ہم رائے اشخاص کی صحبت اختیار کرسکتا ہے۔ لیکن پھر بھی متمدن دُنیا میں بعض باتوں میں رواداری کی اشد ضرورت ہے۔ مثلاً بعض وقت اخبار کسی فرد کے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں اور زندگی اُس غریب کے لئے عذاب ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر نوع کی صحیح رواداری انسانی خوشی کے لئے لابُدی ہے کیونکہ پائدار انفرادی خوشی انفرادی میلانات و تحریکات ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ ایک طرف اگر عام افراد کو خواہ مخواہ رائے عامہ پر پتھر نہ برسانے چاہئیں تو دوسری طرف رائے عامہ کو بھی افراد کی راہ میں روڑے نہ اٹکانے چاہئیں تاکہ ہر شخص جہاں تک مناسب اور ممکن ہو اپنی پسند اور اپنے میلان کے مطابق زندگی بسر کرے اور اس طرح اپنی اور دوسروں کی خوشی اور ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔

(باقی دارد)

بشیر احمد

دوستی وہ ہے جو ہمیں بے طلب ملے محض اس لئے کہ ہم ہمیں ہیں ہمارے جاہ و مال کے لئے نہیں بلکہ صرف ہماری ذات کے لئے۔

پوری لُطف اندوزی صرف دوسروں کی قدردانی سے ہوتی ہے۔

اپنا آپ بنو۔

کم از کم بعض چیزیں ایسی ضرور ہونی چاہئیں جن کے متعلق ہم کبھی ماننے کو تیار نہ ہوں کہ ہم غلطی پر ہیں اور دوسرے راستی پر۔

خوش خلقی معاشری زندگی کی ذمہ داریوں کا اعتراف ہے۔ وہ روزمرہ کی زندگی کو شیریں بنا دیتی ہے۔

جو شخص تعصب کا شکار ہو جاتا ہے وہ پھر غلام بن جاتا ہے۔

ہُوالغنی

ٹھنڈی ہوا ہے، رقص میں ہے ابرِ بہمنی
ہاں دیر کیا ہے، ساقیِ رنگیں ہوالغنی

انسان، اور رہو نہ سکے خوش! ہا! اٹھا تو جام
نادان! تیرے دل کی کلی ہے شگفتنی

ہاں چھیڑ بھی رباب کہ ہے گرمِ اختلاط
حسنِ مہِ دو ہفتہ و ابریقِ یک منی

چھلکا چمن میں جام، کہ یہ رو بھی دیکھ لے
سبزے پہ اوس، اوس پہ مے، مے پہ چاندنی

اُٹھ، گوشِ دل کو قلقلِ مینا سے تیز کر
تا سُن سکے صبا کے سخن ہائے گفتنی

آ مست ہو کے حسن کو دے دعوتِ نیاز
نبضِ صنم میں گرم ہے خونِ برہمنی

صہبا سے دھو نگاہ، کہ غلطاں ہے دیر سے
جاناں کے دل میں آرزوئے برقع افگنی

واللہ آج ہند میں تو جوش فرد ہے
رحمت خدا کی تجھ پہ ہو اے مردِ یک فنی

جوش ملیح آبادی

میرا سخت ترین نقاد

کل ایک صاحب جن سے کچھ تکلف بھی ہے اور کافی بے تکلفی بھی ہے میرے کمرے میں آ ڈٹے اور ایسے کہ "ملنے کا نام نہ لیں۔ دو چار مرتبہ دبی زبان سے کہا بھی کہ تمہارا وقت قیمتی ہوگا مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ فرمانے لگے کام تو روز ہی کرتا ہوں اور تم بھی شاید کرتے ہو مگر یہ موقع غنیمت ہے"۔

ادھر کی اُدھر کی ہزاروں باتیں کر ڈالیں۔ بیسیوں سگرٹوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا اور آخر کار کہنے لگے جس مطلب کے لئے آیا تھا وہ اب بیان کرتا ہوں۔ میرے سوال پر کہ کیا یہی موقع مناسب ہے فرمانے لگے "قطعی"

ناچار کہا کہ "جی ہاں ضرور۔ کیا ارشاد ہے"؟

ملاقاتی:۔ "ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کی تیاری کا وقت ہے اور مجھے ڈر ہے کہ شاید آپ پھر اُس میں کچھ اُسی قسم کے پریشان فقرے لکھ دیں گے، جن سے دُنیا اکتا چکی ہے۔

میں (چونک کر) حضرت کیسے فقرے؟

ملاقاتی۔ جناب آپ کے سر پر صنفِ نازک کی پرستش کا بھوت سوار ہے۔ عورت نہ ہوئی کمبخت الف لیلیٰ کی داستان ہوئی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔

میں۔ سنئے جنوری نمبر کے لئے یہ ایک پرانی چیز بھیجنے کا خیال کر رہا تھا۔

ملاقاتی۔ سُنایئے۔

میں پڑھ کر سناتا ہوں:۔

"اے میرے اچھے سے دل، اے میرے نچلے سے دل، تُو جا! تو جا مگر وہ آرزوئیں جن سے تجھے سجایا تھا چھوڑ جا۔ آرزوئیں میری ہیں تیری نہیں۔ اے دل تو محض خالی کمرہ ہے۔ محض ننگی دیواریں، بن ڈھکی چھت اور بے فرش کی زمین۔ یہ صرف میری آرزوئیں کی بدولت تیری دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں ہیں۔ نیچے قیمتی قالینوں کا فرش ہے، چھت پر گلکاری ہے اور عشق کی بجلی کی روشنی ہے۔

ہاں تو تُو جا! جہاں تُو جا رہا ہے وہ مکان میرا دیکھا ہُوا ہے۔ وہاں کے مکین میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ نہیں میں تجھے سمجھا نہیں رہا۔ اچھے دل! میں اُن پرانے احمق ناصحوں میں سے ہرگز نہیں کہ تجھ پر نیک و بد واضح کروں۔ نہ تو نیک و بد کا قائل

نہ ہیں ناصح بننے کے قابل ہاں تاناجاناخوشی کا قسمت آزمائی کوئی گناہ نہیں۔ جا اور شوق سے جا مگر میری آرزوئیں چھوڑ جا۔
"وہ کیا کرتی ہوگی؟" نہیں۔ میں تیرے قصے نہیں سنتا تو کہاں کا ایسا ولی ہے کہ رعنائی حسن کے کرشمے تجھ پر کشف ہوں؟
اے دل! مجھ سے بحث نہ کر تو اپنا علمی سرکس رہنے دے۔ مانا کہ تیرے بیان میں فلسفے کے فقیر اور مذہب کے ہاتھی لڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی مانا کہ تو ایسا گرا پڑا نہیں کہ تیری آؤ بھگت نہ ہو مگر کہاں تو کہاں وہ!
تو نہیں مانتا! اچھا تو جا۔ مگر میری ایک آرزو چھوڑ جا۔ کون سی آرزو؟ وہی کہ وقت اور حسن کی جنگ میں اُس کا حسن غالب نکلے
یہ آرزو تجھ سے لے لوں تو تو نہ جائے گا میری بلا سے۔ اے بزدل دل! میں تیری گھاتوں سے خوب واقف ہوں۔
اس کی خدمت میں تو انوکھا بن کر پیش ہونا چاہتا ہے۔
جا تجھ میں کچھ بھی نہیں

ملاقاتی۔ لاحول ولا قوۃ۔ آخر اس کا مطلب؟

میں۔ حضرت! مطلب خاک نہیں۔ دل کو آباد کر کے اجاڑنا میرا کھیل ہے۔ مجھے اپنے آپ پر ڈاکا ڈالنے میں وہ لطف حاصل ہوتا ہے جو سکندر اعظم کو سلطنتیں زیر کر کے نہ ہوا تھا۔ میرے دل میں اور مجھ میں جو باتیں ہوئی ہیں وہ بجائے خود انسانی تاریخ ہیں۔
میرے دل میں کبھی طوف حرم کی بھول بھلیاں تھیں۔ سجدوں کے شوق سے چپہ چپہ محراب تھا۔ خطبوں کے جوش سے دل کے کونے کونے میں منبر تھے۔
اور پھر جو ہوا بدلی تو دل کی وہ مسجدیں اُجڑ گئیں۔ خدا کی بجائے قوم سر پر سوار ہوئی اور رو رو قوم کے ماتم ہوئے، کبھی ترقی کے نام پر، کبھی وفا کے نام پر اور کبھی دنیاوی عزو جاہ کے نام پر کہ فرشتے جگر تھام کر بیٹھ گئے۔ مگر حضرت تم یہ قصے کتنے فضول ہیں۔ تم سے خدا نہ چھٹا۔ تم اسے رٹے جا رہے ہو۔ تمہیں وہ کچھ نہ کچھ ضرور دے دے گا۔ فرق تم میں اور مجھ میں بس اتنا ہے کہ تم اس سے کچھ کہنا چاہتے ہو میں اپنا آپ اُسے دینا چاہتا تھا۔ مگر نہ میں اس کے کام کا نکلا نہ وہ میرے کام آیا اور یہ قصہ بھی ختم ہوا۔
میں اب صرف قزاق ہوں۔ جونہی دل میں کوئی خیال جاگزیں ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے فوراً اس پر بالقصد ڈاکا ڈالتا ہوں اور اُسے لوٹ کھسوٹ کے باہر کرتا ہوں۔ معقولیت پسند ہونے سے کس قدر مجھے عار ہے!

ملاقاتی۔ آپ کو معقول ہونے سے عار ہو یا معقولیت کو آپ سے نفرت ہو دنیا کو کیا مصیبت ہے کہ وہ یہ سب کچھ پڑھے۔

میں۔ تم خاک نہیں سمجھتے۔ یہ میرا قصہ نہیں ہر ایک کا ہے۔ ہم سب دم بدم بدلتے رہتے ہیں صرف لوگوں کو یہ جرأت نہیں کہ اس تبدیلی کو محسوس کریں۔

ملاقاتی۔ قطعی غلط۔ اگر ہم اس قدر بدلیں تو پھر پہچانے کیسے جائیں؟ خدا کے لئے "ہمایوں" کو اس قسم کے خرافات سے محفوظ رکھیے۔

میں۔ اچھا اسے جانے دو۔ یہ اور ایک پُرانی چیز سنو۔
ملاقاتی۔ کہو۔
میں پڑھ کر سناتا ہوں :۔

دُنیا ہزارہا سال سے ایک ہی قسم کے بے شمار انسان پیدا کرتی چلی جارہی ہے یعنی وہ ردّی قسم جس کی خواہش یہ ہے کہ عشق کا عیش ہو، شہرت کے ڈھول ہوں یا وہ دوسری کثیر التعداد قسم جو ہل چلا چلا کر یا نوکری ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یا دوسروں کے فائدے کے لئے دوسروں کا کہا مان کر بے گہوارہ کی پیدائش سے، بے کفن کی موت تک کا سارا رستہ نیم برہنگی اور نیم فاقے میں طے کرلیتی ہے۔ کیا دنیا اس اپنے کرتوت سے کبھی نہ شرمائے گی؟ کاش دُنیا کے یہ پرانے سانچے ٹوٹ جائیں ٹکسالیں نئی ہوں توشاید عقلیں بھی کچھ طرار طرحدار ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ملاقاتی۔ (کانوں میں انگلیاں دے کر) خدا کے لئے اس کو بند کرو۔ حضرت کیا آپ کو جنون ہے کہ آپ دنیا غریب کے پیچھے یوں لاٹھی لئے پھرتے ہیں۔



میں۔ اچھا ایک علمی مضمون سنو۔
ملاقاتی۔ بہتر سناؤ۔
میں۔ پڑھ کر سناتا ہوں :۔

اخلاق کی اُقلیدَس

بسم اللہ الحکیم والجبار والقہار

جن لوگوں کی اردو کو پنجابی سے پردہ ہے اُن کی اطلاع کے لئے صرف اس قدر گزارش ہے کہ جس پنجابی سکول میں اینجانب نے اقلیدس کو دماغی ستیاناس کرنیکی اجازت دی وہاں کے ریاضی کے مدرّس کے طریق تعلیم سے ہم نے یہی نتیجہ نکالا کہ مسماۃ اقلیدس میاں الجبرا کی گھروالی ہے اور اسی دن سے ہمارے ذہن میں اقلیدس کا شمار صیغۂ مؤنث میں ہے۔ یہ تو ہمیں برسوں بعد پتا چلا کہ یوکلڈ ایک یونانی مرد کا نام تھا۔ مگر ہماری بلا سے اگر عرب والے یوکلڈ کو اقلیدس کرسکتے ہیں تو پنجاب والے اسی بھوت کو بھتنی سمجھ لیں تو کیا گناہ!

آمدم بر سرِ مطلب

اُقلیدس نقطے سے شروع ہوتی ہے اور نقطے کی قطعی صحیح تعریف یہ ہے کہ نقطہ وہ چیز ہے جو سمجھ میں آئے مگر موجود نہ ہو۔ اسی طرح خطِ مستقیم کی اُقلیدس میں صحیح تعریف یہ ہے کہ خطِ مستقیم کسی نقطے کا وہ نقشِ پا ہے جب کہ وہ نقطہ سفر کرتا ہُوا اِدھر اُدھر بھٹکے

دائرہ کی تعریف یہ ہے کہ دائرہ اس مجبور نقطہ کا نقش پا ہے جو لاکھ چکر کھائے مگر ایک اور نقطے سے جس کا نام مرکز ہے مساوی فاصلہ پر رہے۔ ان تین تعریفوں پر تمام اقلیدس کا دارومدار ہے۔ جب یہ تین تعریفیں ہماری سمجھ میں آگئیں تو کمبخت اقلیدس نے بیسیوں اور باتیں ہمارے دماغ میں ٹھونس دیں یعنی یہ کہ مثلث کے تین زاویے ہر حالت میں دو قائم الزاویوں کے برابر ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ +

چونکہ اخلاقیات سے ہمیں خاص شغف ہے اس لئے ہم اسے اقلیدس کے طریقے پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں + جیسے ہماری تعریفیں یا نتائج سے اتفاق نہ ہو وہ اگر نیم کافر نہیں تو کچھ بحث فرود ہوگا +

اخلاق کی ابتدا زندگی سے ہے، جہاں زندگی نہیں وہاں اخلاق ناممکن۔ گویا اخلاقیات میں زندگی کا وہی پایہ ہے جو اقلیدس میں نقطے کا۔ مگر اقلیدس کے نقطے کے برعکس زندگی وہ چیز ہے جو موجود ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی طرح صراطِ مستقیم زندگی کا وہ نقش پا ہے جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ جو جتنا بھٹکے اسی قدر راہِ راست پر ہو۔ مثال کے طور پر عرب کی تاریخ پر غور کر لیجئے۔ جب عرب والے فسق و فجور و جہالت و ظلم کے رستوں پر بے حد بھٹک چکے تو وہاں رحمتِ الٰہی سے ایسا پیغمبر نازل ہوا کہ تمام دنیا کو اس کی ذات پر ہمیشہ کے لئے فخر کرنا واجب ہے عربوں کے لئے بھٹکنا ہی صراطِ مستقیم تھا۔ اگر وہ کم بھٹکتے تو انہیں یہ فخر حاصل نہ ہوتا۔ بھٹکتے بھٹکتے انہوں نے اُس شاندار کمال کو حاصل کر لیا جس کے لئے زوال ناممکن ہے۔ اسی بات کا ایک نفی کا پہلو بھی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک شخص اورنگ زیب کا ذکر ہے۔ اس شخص کی نسبت یہ امر مسلم ہے کہ اسے تمام عمر ذرا سی غلطی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ اور تمام عمر باوجود "زندہ پیر" ہونے کے اسے ایک بھی سچا دوست نہ ملا" آہ از مردمان کار" آہ از مردمان کار" چلا تا چلاتا مر گیا۔ نہ وہ بھٹکا نہ اُس نے کچھ پایا +

اخلاقیات میں دائرے کی تعریف سخت مشکل ہے، مگر ناممکن نہیں۔ تمام اخلاق کا مرکز گناہ ہے۔ زندگی کا نقطہ تبھی ایک مکمل دائرہ تیار کر سکتا ہے جب گناہ سے ہر وقت مساوی فاصلہ رکھنے کی طاقت اس میں موجود ہو۔ جہاں گناہ سے نفرت ہوئی اور زندگی بھک کر کسی ایک طرف چلی وہیں دائرہ ٹوٹا اور جب کسی دائرے میں ذرا سی بھی شکن آگئی تو یہ یقینی ہے کہ کوئی طاقت اسے دائرہ نہیں بنا سکتی۔ گویا گناہ کی طرف برابر کھینچتے رہنے پر کامیابی کا مدار ہے +

ملا فانی (بے حد طیش سے) ایسی مضمون نگاری پر ہزار لعنت (غصہ میں آکر اُٹھ بیٹھتا ہے)

میں - حضرت تشریف رکھئے۔

ملا فانی - کیا تمہیں عشقِ حقیقی سے ذرا بھی مس نہیں ؟

میں - عشقِ حقیقی سے تو کوسوں بھاگتا ہوں۔

ملا فانی - وہ کیوں ؟

میں - لمبی بات ہے سنو تو کہوں۔

ملا فانی - کہئے۔

ہیں۔ انگریزی عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں بدترین چیز وعظ ہے اور یہ کہنا بھی وعظ ہے چنانچہ اسی لئے انگریز وعظ سُن لیتے ہیں مگر ایسی طرح کہ اِس کان سے سُنا اُس کان سے نکالا۔ انگریز عام طور پر پسند یہ کرتے ہیں کہ ان کا پادری وعظ اچھا کہے یا بُرا یا نہ کہے مگر مستند ضرور ہو۔ چند ہی دن کا ذکر ہے کہ ایک مشہور پادری کی نسبت فخریہ اخباروں میں لکھا گیا تھا کہ وہ musailar Christianity (یعنی پہلوانی عیسائیت) کا نہایت شاندار نمونہ تھا۔

ایک پادری سے جب اس کی چلبلی بیٹی نے کہہ ہی دیا کہ "ابا آج کا آپ کا وعظ تو خوب رہا" تو پادری صاحب نہایت بے تکلفی سے فرمانے لگے کہ "بیٹی ہمیشہ چھ پنس میں خرید تا تھا اس پر پورے ڈھائی شلنگ صرف کر ڈالے۔ کیا کرتا چندہ بھی تو جمع کرنا تھا"۔ یہ ہے انگریزی قوم کی موقع شناسی کا ادنےٰ ثبوت۔

جس طرح انگریزی قوم کا یہ یقین ہے کہ وعظ (Preaching) دنیا کی بدترین حرکت ہے (چنانچہ وہ اُس نظم یا ناول کو بھی چنداں پسند نہیں کرتے جس میں وعظ ہو) اسی طرح اس قوم کا یہ بھی مسلک ہے کہ دنیا کی بہترین چیز عشق ہے۔ ان کے نزدیک خدا خود عشق ہے اور وہ اس شق میں اس قدر ماہر ہیں کہ انہوں نے عشق کی تمام قسموں کو سر سے پاؤں تک چھان ڈالا ہے۔ عشق ان کی کتابوں میں بالکل اس ترتیب سے مقفل موجود اور محفوظ ہے جیسے سپتالوں میں ٹکٹ لگی ہوئی مختلف قسم کے زہر کی بوتلیں۔ جس شخص کو جتنا عشق اور جس قسم کا عشق درکار ہو اسے اتنی ہی بوندیں (دن میں تین دفعہ کھانے کے بعد) دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ عشق کی چند مشہور قسمیں گنوا دی جائیں مثلاً اوّل عشقِ حقیقی۔ انگریزی اخلاقی قرابادین میں عشقِ حقیقی وہ ہے جس کا پول نہ کھلا ہو۔ اب اس کے نمونے ملاحظہ ہوں (ا) کسی بڑے مشہور انسان کا عشق اپنے بڑے خدا کے ساتھ یا اپنی چھوٹی بکری کے ساتھ۔ دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ آسمان پر خدا زمین پر بکری۔ خدا بکری کو پالتا ہے بکری انسان کو پالتی ہے۔ انسان اپنی ضد کو پالتا ہے (ب) کسی سفید گورنمنٹ کا عشق اپنی سیاہ پولیس سے۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ اوپر گورنمنٹ نیچے پولیس۔ گورنمنٹ پولیس کو پالتی ہے۔ پولیس داروغہ جیل کو پالتی ہے۔ داروغہ جیل جرم پالتا ہے (ج) کسی وفادار مولانا کا اپنی مفقود الخبر خلافت سے عشق۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ . . . .

ملاقاتی غصہ سے لال پیلا، میری طرف جھپٹنے کو تھا کہ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ڈرسنگ روم میں داخل ہو کر ان حضرت نے میرا اچھے سے اچھا سوٹ پہنا بہتر سے بہتر میری نکٹائی ڈانٹی اور میری نئی چھڑی ہاتھ میں لے یہ جا وہ جا۔ پھر تو کمرے میں نہ میں تھا نہ وہ تھا۔ مگر واللہ باللہ یہ باتیں ضرور ہوئیں۔

فلک پیما

فیضانِ عشق

قربانِ عشق! بندۂ جاناں بنا دیا   فرماں روائے عالمِ امکان بنا دیا

اک نا سزا کو سلطنتِ درد سونپ دی   اک بے نوا کو غیرتِ سلطاں بنا دیا

اک بے بصر کو طاقتِ دیدار بخش دی   اک بے خبر کو صاحبِ عرفاں بنا دیا

قطرے کو رتبۂ یمِ زخّار دے دیا   ذرّے کو آفتابِ درخشاں بنا دیا

فرشِ زمیں سے عرش پہ لا کر بٹھا دیا   ہمپایۂ عطارد و کیواں بنا دیا

غمناک کو نگارِ طرب سے ملا دیا   خاشاک کو بہار بداماں بنا دیا

دورِ ستم کو دورِ کرم سے بدل دیا   فصلِ خزاں کو فصلِ بہاراں بنا دیا

ہستی کا چپہ چپہ بہاروں سے بھر دیا   عالم کا گوشہ گوشہ گلستاں بنا دیا

میخوار و نغمہ بار و مے افشاں دکھا دیا   گل ریز و رنگ ریز و غزل خواں بنا دیا

ساری زمین کو جلوۂ جاناں سے پاٹ کر   سارے جہاں کو روضۂ رضواں بنا دیا

سر تا بپا حیات میں تبدیل کر دیا   سر تا بپا مجسّمۂ جاں بنا دیا

سر تا قدم ثبات میں تبدیل کر دیا   سر تا قدم حرارتِ ایماں بنا دیا

خاموش گفتگو کا طریقہ سکھا دیا   اربابِ آرزو کا زباں داں بنا دیا

جامِ شرابِ فقر کا چسکا لگا دیا ۔۔۔ لذت شناسِ بادۂ عرفاں بنا دیا

سارا جہان شورِ اناالحق سے گونج اُٹھا ۔۔۔ کُل دہر کو حقیقتِ عریاں بنا دیا

آفاتِ روزگار کا خطرہ مٹا دیا ۔۔۔ مامُونِ فتنۂ غمِ دوراں بنا دیا

دامِ جفائے دیوِ لعیں سے چھُڑا دیا ۔۔۔ مقرونِ فضل و رحمتِ یزداں بنا دیا

بیگانۂ خیالِ غمِ ہجر کر دیا ۔۔۔ ناقابلِ تصوّرِ حرماں بنا دیا

دشوارئ نجات کا قصّہ چکا دیا ۔۔۔ غمخوارئ حیات کو آساں بنا دیا

کثرت میں جلوۂ رُخِ وحدت دکھا دیا ۔۔۔ کافر بنا کے رشکِ مُسلماں بنا دیا

صدق و صفا کا جذبۂ بیخوف اُبھار کر ۔۔۔ غارت گرِ مکائدِ شیطاں بنا دیا

کارِ بزرگِ خدمتِ میخانہ سونپ کر ۔۔۔ پیرِ طریق بادہ گساراں بنا دیا

نشرِ گنہ کی جرأتِ بیباک بخش کر ۔۔۔ پیغمبرِ شریعتِ عصیاں بنا دیا

آزاد! شکرِ عشقِ بتاں ۔ جس کے فیض نے

دل دادۂ پرستشِ یزداں بنا دیا

حکیم آزاد انصاری

پہاڑی لڑکی

(۱)

جب پہاڑ کے دامن میں شمشاد کی بلند ٹہنیوں پر چڑیا صبح کا شیریں راگ گا چکتی اور سورج کی کانپتی ہوئی زرد کرنیں رفتہ رفتہ روشن سایوں میں تبدیل ہو کر چھوٹے سے گاؤں کے در و دیوار پر پھیل جاتیں اُس وقت پہاڑی لڑکی جلد جلد رات کا بچا بچایا باسی کھانا کھا کر اپنے جھونپڑے سے باہر نکلتی اور بکریوں کے چھوٹے سے گلے کو ہانکتی ہوئی پہاڑ کی طرف لے جاتی۔

دن بھر وہ اپنی رفیق بکریوں کے پیچھے پہاڑ کی اونچی نیچی گھاٹیوں پر اچکتی ہوئی نظر آتی اور جنگلی چڑیوں کی طرح اُس کی تنہا مسرت کے چہچے کوہسار میں گونجا کرتے۔ پہاڑی درختوں پر چڑھ کر گھونسلوں میں سے پرندوں کے انڈے بچے کھینچ نکالنا یا کسی چشمے کے کنارے بیٹھ کر پانی میں اپنے عکس کا منہ چڑانا، یا مٹی اور ریت میں سے ٹوٹے پھوٹے گھونگے چن کر ہار پرو لینا، یہی تھی سادہ دل لڑکی کی زندگی۔

ماں، باپ کی شفقت یا بہن، بھائیوں کی محبت سے وہ قطعاً آشنا نہ تھی۔ بچپن سے لے کر لڑکپن تک وہ اپنے آپ کو ایک شفیق آقا کے گھر سے وابستہ دیکھتی چلی آئی تھی جو ایک سیدھا سادھا پہاڑی کسان تھا۔ یہ غریب کسان اور اُس کی محنت کش بیوی دونوں یتیم لڑکی پر مہربان تھے لیکن اُسی طرح جیسے ایک نیک دل آقا اپنے فرمانبردار غلام پر شفقت کی نظر رکھتا ہے، اور اس سے زیادہ کی غریب لڑکی کو نہ خواہش تھی اور نہ یہ بات اُس کے خیال میں بھی آ سکتی تھی کہ اس سے بہتر سلوک یا اس سے زیادہ محبت کی میں مستحق ہو سکتی ہوں۔

اپنے دل کی محدود سی دُنیا میں ہر طرح وہ مطمئن تھی۔ رات کے وقت سونے سے پہلے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے اُس کا گہرا سوچ بچار، اُس کی تمام تر غور و فکر یہی ہوتی کہ کل میں اپنی بکریوں کو کونسی ایسی سرسبز وادی میں لے جاؤں جہاں انہیں آج سے بہتر چارہ مل سکے اور ہر شام مالکہ دُودھ کے برتن کو معمول سے زیادہ بوجھل پائے۔ اُس کی مسرت شام کے وقت انتہا کو پہنچ چکی ہوتی جب بکریاں پیٹ بھر کر اُس کے آگے آگے گھر کی طرف جانے کو ہوتیں۔ اُس وقت اسے بکریوں کی وحشیانہ کُودپھاند آس پاس کے تمام خوبصورت مناظر سے زیادہ دلفریب معلوم ہوتی۔ طفلانہ شوخی سے کبھی وہ اُن کے ساتھ مل کر خود بھی ایک چھوٹی سی بکری کی طرح ممیانے لگتی اور کبھی آگے بڑھ کر اپنا صبیح چہرہ ان کے لمبے لمبے سُرخ بالوں میں چھپا لیتی، اور پھر خود بخود ہنس دیتی۔ بکریوں کے قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ اور گھنگروؤں کی دھیمی دھیمی کھنکھناہٹ کے ساتھ مل کر معصوم لڑکی کے قہقہے مرغزار کی خاموش فضا میں ایک نئی دنیا کو بیدار کر دیتے جہاں شفق کی رنگینیوں کے درمیان صرف ہنسی کا ہلکا سا ترنم ہوتا اور آسمانی رحمت کے ساتھ ملی ہوئی بے لوث مسرت۔

دن بھر کی محنت کے بعد اُس کا آقا شام کے کھانے پینے سے فارغ ہو کر اپنے جھونپڑے میں خشک پیال کے فرش پر مٹی کا ایک پُرانا ساحقہ لے کر بیٹھ جاتا اور اُس کے سب چھوٹے بڑے بچے اُس کے گرد جمع ہو جاتے۔ انہیں بچوں میں ایک بچے کے مانند وہ بھی



جنگل کی شہزادی

Victoria Press, Lahore.



Victoria Press Lahore.

شامل ہوتی، اگرچہ طفلی کی پُرسرور ساعتیں بے خبری میں اُس کا ساتھ چھوڑ کر آہستہ آہستہ اب پیچھے رہی جاتی تھیں+

چھوٹے بچے کھیل میں اُسے گھوڑا بنا کر اُس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے، شرارت سے اُس کے بال کھینچتے اور اُسے مارتے۔ ان کی شرارتوں پر ہنستے ہنستے اُس کا بُرا حال ہو جاتا۔ وہ انہیں اپنی پیٹھ پر سوار کر لیتی اور گھٹنوں کے بل جھونپڑے میں ادھر سے اُدھر لئے پھرتی۔ جب گھر کی مالکہ شام کے کام کاج سے فارغ ہوتی اور چرخہ کاتنے کے لئے اندر آ کر چراغ جلاتی تو بچے روشنی کی خوشی میں شور مچا دیتے۔ آخر باپ بچوں کی شوخیوں سے تنگ آ جاتا اور فوراً کوئی کہانی سنانا شروع کر دیتا۔ اس پر سب بچے خاموش بیٹھ جاتے۔ بعض وقت وہ اپنے ہی لڑکپن یا نوجوانی کے زمانے کا کوئی قصہ بیان کرنے لگتا جس میں زیادہ تر بھوت، پریت، جن، پری وغیرہ کا ذکر ہوتا۔ لیکن جس قدر یہ ذکر بچوں کو بھیانک معلوم ہوتا اتنی ہی زیادہ دلچسپی اور توجہ سے وہ اسے سُنتے+

وہ انہیں بتاتا کہ جب وہ لڑکا ہی تھا اور گھر بار کی کوئی ذمہ داری اُس کے سر پر نہ پڑی تھی تو اُسے بھوت پریت کو تابع کرنے کا شوق پیدا ہوا اور اُس شوق میں اِس نے کیا کیا کوششیں کیں۔ پھر کس طرح اُس زمانے میں سُرخ کپڑوں والی چڑیلیں جنگل میں اُس کے پیچھے پیچھے اُس کا نام پکارتی پھرا کرتی تھیں لیکن بغیر اُن کی طرف پلٹ کر دیکھے وہ ہمیشہ اُن کی اصلیت معلوم کر لیتا، اور محض ان عجیب وغریب "اسموں" کی وجہ سے جو اُسے ان دنوں حفظ تھے، وہ صاف بچ نکلتا+ اور کس طرح شام کے وقت بیابان میں چھلاوے خوبصورت میمنوں کا رُوپ بھر کر اُس کی راہ میں آ کھڑے ہوتے، لیکن صرف اپنے علم کی طاقت سے وہ معلوم کر لیتا کہ یہ وہی چھلاوا ہے جسے چھو لینے کے بعد انسان کبھی زندہ سلامت نہیں بچ سکتا+ پھر کس طرح ایک رات بھوت اُسے جنوں اور پریوں کے مُلک میں لے گئے اور رات کی رات میں وہ سارے ملک میں سیر کر کے صبح پھر اسی طرح اپنے بستر پر آ موجود ہوا، حتیٰ کہ بعض لوگ وہم کرنے لگے کہ اُس نے کوئی خواب دیکھا ہے+ پھر وہ انہیں سناتا کہ کس طرح وہ غاروں میں چھپے ہوئے جنگلی بّرے پکڑا کرتا تھا اور کس دلیری سے ایک عرصہ تک اُس نے شیر کو مار کر اُس کی کھال اُتارنے کی کوششیں جاری رکھیں+

سادہ دل لڑکی چراغ کی دھیمی روشنی میں اپنے محنت کش آقا کے کرخت اور پُر شکن چہرے پر عقیدت کی نظریں گاڑے ہوئے یہ قصے سُنتی اور دل ہی دل میں اُس کی دانائی اور عقل پر حیران ہوتی اور خیال کرتی کہ وہ کس قدر دلیر اور طاقتور ہے۔ شاید دنیا میں کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا+

(۲)

شاہزادہ حسبِ معمول اپنے محل سے شکار کھیلنے کے لئے نکلا تھا لیکن بکریاں چرانے والی غریب لڑکی کی قسمت اُسے شکار کے پیچھے بھٹکا کر پہاڑوں کے سلسلے میں لے آئی۔ وہ چشمے کے کنارے اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے کھڑی تھی شہزادے کا گھوڑا وہیں رُک گیا اور کوئی وحشی ہرن پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر چوکڑیاں بھرتا ہوا کہیں کا کہیں جا نکلا لیکن شہزادہ پھر بھی وہیں مبہوت و ششدر کھڑا تھا جیسے شکار کا خیال تک اُس کے دل سے محو ہو چکا ہے۔ کئی خیال اس کے دل میں آئے اور چلے گئے۔ آج سے پہلے بھی کسی حسین چہرے میں اُس نے یہ کشش محسوس کی تھی؟ نہیں کسی میں یہ سحر نہ تھا۔ ان بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کیا جھلکتا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا ——— غریب پہاڑی لڑکی اور اُس کی بکریاں اُسے ایک افسانہ معلوم ہو رہی تھیں ——— "شاید وہ ایک شہزادی تھی حسین وجمیل، اور بھولی بھالی اُس کی صورت

پر ہر ایک کو پیار آتا تھا، لیکن اُس کے ظالم باپ نے ناراض ہو کر اُسے محل سے نکال دیا، اُس کا خوبصورت لباس چھین کر اُسے گودڑ پہنا دیا پھر وہ جنگل میں بکریاں چرایا کرتی تھی، وہ لوگوں سے چھپ کر زندگی بسر کرتی تھی اور اپنی پلٹی ہوئی قسمت پر کبھی کبھی رو تی تھی ـــ آخر ایک دن ایک شہزادہ آیا......

پہاڑی لڑکی نے سادگی سے نظر اُٹھا کر محوِ حیرت شہزادے کو دیکھا اور شہزادے نے محسوس کیا کہ دو چمکتی ہوئی تیز بجلیاں چشم زدن میں آکر اُس کے پہلو میں پیوست ہو گئیں، مُدتوں سے اُس کے بھٹکتے ہوئے تخیل میں کوئی محبوب سا تصور چکر لگا رہا تھا اُس کے دل کی پوشیدہ ترین گہرائیوں میں ایک ننھا سا رنگین پھُول چپکے چپکے کھلا ہوا تھا اور وہی رنگین پھول، وہی محبوب تصور، ایک زندہ تصویر بن کر اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا معلوم ہُوا ـــــــ بہت جلد وہ ایک فیصلہ پر پہنچ چکا تھا اور پھر وہ کچھ کہنے اور کچھ سننے کے لئے آگے بڑھا۔

آزاد اور خوش باش پہاڑی لڑکی جو کبھی باز کے پنجے میں پھنسی ہوئی چڑیا کی مضطربانہ چوں چوں سن کر خوشی سے تالیاں بجانے لگ جایا کرتی تھی اب خود کسی خوف زدہ چڑیا کے مانند سہمی ہوئی شہزادے کے تازی گھوڑے کی پشت پر اُس کے سامنے جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اور غم و کرب سے آنسو اُس کی سیاہ آنکھوں میں خشک ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن باوجود انتہائی خوف و ہراس کے بار بار بے تابی سے وہ اپنا سر پیچھے کی طرف موڑتی جہاں دور ٹیلوں پر اُس کی محبوب بکریاں منہ اُٹھائے حیران کھڑی تھیں۔

شہزادے کا دل کسی بڑی سے بڑی کامرانی پر بھی کبھی اس قدر مسرور نہ ہُوا تھا پھر وہ کیونکر جان سکتا کہ آج اُس نے ایک ایسے دل کی دُنیا کو جو محض ہنسی خوشی کے چہچہوں سے آباد تھی تہ و بالا کر دیا۔

جب وہ شہر کے بڑے دروازے میں داخل ہوئی تو حیرت میں ڈوبی ہوئی بے شمار نگاہیں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وُہ خود بھی مارے استعجاب کے آنکھ تک نہ جھپک سکتی تھی، سارا شہر اور اُس کے رہنے والے اسے جادُو کا ایک کھیل نظر آتے، اور وہ حیران تھی کہ یہ عجیب و غریب لوگ سب کے سب کیوں اُسے اس طرح تعجب سے دیکھ رہے ہیں۔

جس طرح ایک نازک پھول کسی سنسان وادی میں جنگلی گھاس پتیوں کے درمیان آنکھ کھولتا ہے ـــــ دور دُنیا اور دنیا والوں کی شورشوں سے الگ تھلگ ـــــ جس کی خاموش محفل تک بلبل کے پرسوز نغمے حسن کو مغرُور بنانے کے لئے نہیں پہنچتے، جس کی آنکھ بھونروں کے والہانہ رقص سے کبھی شناسا نہیں ہوتی اُسی طرح غریب لڑکی بھی اپنے حسُن سے، قدرت کے اِس بہترین عطیہ سے بے خبر تھی۔ جس گھر میں اُس نے پرورش پائی تھی وہاں اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دینا، یہی ایک چیز تھی جس سے دوسروں کے دل میں اُس کی جگہ ہو سکتی تھی۔ گھاس پھوس کے اُن سادہ جھونپڑوں میں جو شہروں کی پُر تکلف شان و شوکت کی زندگی سے بے خبر دُور پہاڑ کے دامن میں آباد تھے کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جو اس کے حسن کی اصل قدر و قیمت کو پہچان سکتی۔ وہاں تو وہ محض ایک محتاج لڑکی تھی، صرف دوسروں کے رحم کی مستحق۔

شہزادے کے شاعر مصاحب نے کہا "شہزادے تیرے انتخاب کا جواب واقعی اس روئے زمین پر ملنا آسان نہیں، اس عجیب و غریب لڑکی کا حسن ان پھٹے پرانے چیتھڑوں میں اتنا ہی روشن، اتنا ہی درخشاں نظر آتا ہے جتنا وہ تنہا ستارہ جو برسات کی کسی ابر آلود شام

کو گھرے سیاہ بادلوں کے درمیان یک بیک جگمگا اُٹھتا ہے"+

اور اس روز محل کی تمام خوبصورت لڑکیاں افسردہ خاطر اور اُداس نظر آتی تھیں اور بعض رات کے وقت اپنے بستر پر پڑی ہوئی موت کی آرزو کر رہی تھیں+

دوسری صبح غریب لڑکی شہزادیوں کے سے زنانہ لباس میں ملبوس کردی گئی اور شہزادے کے خوبصورت ترین جواہرات اب اس کے جسم کی زینت تھے ـــــــ لیکن اُس کا آزاد دل اب بھی بدستور انہیں پہاڑوں، انہیں ندی نالوں، اور انہیں گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا+

شہزادے کی تمام دلنوازیاں، اُس کے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے پرسحر الفاظ، اُس کی حد سے گزرتی ہوئی شاعرانہ تعریف و توصیف اب صرف جنگلی لڑکی کے لئے وقف تھی+ لیکن یہ سب اُس کے لئے بے معنی تھا+ اُس کے دل میں اگر شہزادے کے لئے کوئی خیال تھا تو صرف یہ کہ "خدا جانے وہ مجھے گھر سے اتنی دُور یہاں کیوں لے آیا ہے اور خدا جانے اب مجھے کب تک وہ اس عجیب و غریب قید میں رکھے گا" اور شہزادے کی تمام مہربانیوں کو دیکھ کر صرف اُس کے دل میں یہ خیال آتا کہ شاید کبھی اسی مہربانی سے وہ مجھے جانے کی اجازت بھی دے دے+

جب شہزادہ اسے مجبور کرتا کہ وہ اُس سے کوئی سوال کرے۔ جس چیز کی اُسے خواہش ہو اُس سے طلب کرے، تو وہ صرف جانے کی خواہش ظاہر کرتی۔ پھر شہزادہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں اُس سے کہتا کیا تم اس عظیم الشان سلطنت کی ملکہ نہ ہو گی؟ اور وہ اُس کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر فوراً سر کو انکار کے طور پر جنبش دیتی۔ ایک ملکہ کے شکوہ کی قدر و قیمت سے وہ بے خبر تھی اور صرف یہ جانتی تھی کہ شہزادے کے انوکھے سوالوں کے جواب میں ایک دفعہ "ہاں" کہہ دینا ہی اسے اس عجیب قید میں کھینچ لایا تھا۔ اور اب اُس کے ہر سوال کے جواب میں وہ انکار ہی کو مناسب خیال کرتی+

شہزادہ یہ جاننے کے باوجود کہ میری باتیں غریب لڑکی کی سمجھ سے بالاتر ہیں اس بے نیازی پر غمگین ہو جاتا+

(۳)

بہت جلد شہزادے کے اس بے حاصل سودا سے سب لوگ اکتا گئے اور ہر ایک کے دل میں پہاڑی لڑکی کے خلاف غصہ کے جذبات اُٹھنے لگے جس کی "منحوس" آمد نے ان کے چہیتے ہنس مکھ شہزادے کو تمام کھیل تماشوں اور سیر و تفریح سے بے پروا بنا کر اُداس اور رنجیدہ بنا دیا تھا۔ آخر دانا وزیروں نے آپس میں مشورہ کر کے شہزادے کو اس بات پر مجبور کیا کہ جب تک جیوانوں میں پلی ہوئی بے سمجھ لڑکی عقل و شعور سیکھ کر اُس کے مرتبے اور محبت کو سمجھنے کے قابل نہ بن لے وہ اُس کے ملنے سے احتراز کرے+ شہزادہ بھی الفت کے رائیگاں اظہار سے تنگ کرنا چاہا اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہو گیا اور لوگ اس کا دل بہلانے کے لئے نئے نئے مشغلے سوچنے لگے+

جلد ہی پہاڑی لڑکی ایک علٰحدہ محل میں بھجوا دی گئی اور شہزادے کے مصاحبوں نے جنہیں اپنی عقل اور تدبر پر ناز تھا شہر کے بڑے بڑے داناؤں کو بیش بہا معاوضے دے کر غریب لڑکی کو عقل و دانش کا سبق دینے کے لئے مقرر کیا اور یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اُس کے

دل و دماغ میں دنیا بھر کا علم ٹھونس دینے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

وہ اُسے اس چھوٹی سی خوشنما دنیا میں سے جس میں آج تک وہ رہی تھی ایک دم کھینچ کر باہر اُس عظیم الشان پرشور دنیا میں لے آنا چاہتے تھے جس میں ہنسی اور قہقہوں کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا +

وہ اُسے دنیا کے مختلف ہنگاموں کے متعلق باتیں سناتے، اُسے سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتے لیکن بغیر ان کی باتوں پر توجہ کئے بغیر کچھ سمجھے وہ عالمِ تصور میں اُس وقت بھی اپنی بکریوں کے پیچھے ٹیلوں اور گھاٹیوں کو پھلانگ رہی ہوتی +

وہ اُسے رام کرنے کے لئے اُس کے سامنے محبت کے درد بھرے افسانے بیان کرتے جنہیں سن کر پتھر بھی پانی ہو جائے لیکن وہ گزشتہ تصورات میں کھوئی ہوئی اپنے آقا کی دلچسپ حکایتوں کو دل ہی دل میں دہرایا کرتی +

وہ اسے گناہ اور نیکی میں امتیاز سکھاتے، رحم، ایثار، اور وفا کے سبق پڑھاتے اور وہ عالمِ خیال میں اُس گھونسلے سے جا کر جو اس دن اس نے ببول کے درخت پر دیکھا تھا فاختہ کے بچے نکالنے میں مصروف ہو جاتی +

وہ اسے شہزادے کی عظمتِ شان اور محبت کی قدر و قیمت بتاتے، اور اُس کا خیال اُسے اُسی غریبانہ جھونپڑے میں پہنچا چکا ہوتا جہاں وہ اپنے آقا اور اس کے بچوں کو اپنا منتظر دیکھتی ـــــــ وہی چراغ کی دھیمی دھیمی روشنی، وہی پیال کا نرم فرش وہی بچوں کا شور، وہی آقا کی دلچسپ باتیں، بہشتِ بریں کے کسی خواب کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے آ کر پھرنے لگتیں +

شہزادے کے حکم سے اُس کے اِرد گرد ہر وقت خواصوں کا ایک جھرمٹ لگا رہتا جو اُس کے دل سے جنگلی وحشیوں کی یاد محو کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتیں، وہ اسے شہزادے کی باتیں سناتیں اور اُسے خوش کرنے کے لئے لہک لہک کر محبت کی لطیف راگنیاں گاتیں، لیکن وہ ان کی ناجنسی صحبت سے اکتا جاتی، ان کی غمناک موسیقی کے شور سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی ـــــــ اور پھر کہیں دور سے خیال ہی خیال میں اُسے اپنی مالکہ کے گیت سنائی دینے جو وہ چرخا کاتتے ہوئے گا رہی ہوتی +

بچپن کی کسی زبردست طفلانہ خواہش کے مانند یہاں سے واپس جانے کی تمنا اس کے دل و دماغ پر اس درجہ غالب آ چکی تھی کہ اُس کے علاوہ وہ کچھ سننا یا سمجھنا نہ چاہتی تھی ـــــــ بظاہر وہ کچھ نہ سمجھی، اُس نے کچھ نہ سنا ـــــــ لیکن آہ! نامعلوم طور پر بہت کچھ اُس کے معصوم دل پر نقش ہوتا چلا گیا +

اُس کی خوبصورت آنکھوں میں غم کا پرتو دیکھ کر لوگ شہزادے کو مبارک دینے لگے "شہزادے! وحشت کی بجائے اب اُس کی آنکھوں سے محبت ٹپکتی ہے"+

اُسے کھوئی ہوئی سی دیکھ کر وہ کہتے "شہزادے! اب تو وہ ہر وقت تیرے ہی خیال میں محو رہتی ہے"+

اُس کے طرز و انداز میں ایک سستی، ایک اضمحلال کی جھلک دیکھ کر وہ کہتے "شہزادے! اب تو وہ ایک ملکہ کی طرح سنجیدہ ہوتی چلی جا رہی ہے"

اور شہزادہ اُن سنہرے خوابوں کے دیکھنے میں محو ہو جاتا جن کی تعبیر ہمیشہ تلخ ہوتی ہے ـــــــ وہ اُس چمکتے ہوئے سراب کی

طرف کھنچا چلا جاتا جیسے بے تھاہ سمندر جان کر پیاسا اس کے کناروں سے ایک بار مایوس لوٹتا ہے۔

ہر روز وہ اس سے کہنے کے لئے نئی نئی باتیں سوچتا، ہر روز اسے نئے ہی نئے خیال سوجھتے ـــــــ ہاں اب جب کہ وہ ایک ملکہ کی طرح سنجیدہ اور سمجھ دار ہو چلی تھی +

(۴)

شہزادہ اسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے دفعتہً سب کچھ بھول گیا۔ اس کی نگاہ حیرت سے پہاڑی لڑکی کے خدو خال پر جمی ہوئی تھی ـــــــ کیا یہ وہی تھی؟ ـــــــ "اُف کس قدر وہ بدل چکی تھی" ـــــــ اُس کی دلکش نورانی آنکھوں میں اب پتھر کی سی سختی تھی اور بیزاری ـــــــ "اور محبت؟"

شہزادے نے خیال کیا آہ، وُہ سب فریب تھا محبت ان آنکھوں میں کبھی بیدار نہ ہوگی۔ اُس کا گلابی پھول کا سا چہرہ اب اترا ہُوا اور زرد تھا جیسے سموم ہواؤں نے کسی نازک پھول کو جھلس ڈالا ہو ـــــــ حسن باقی تھا لیکن سحر زائل ہو چکا تھا + ـــــــ کس قدر فرق تھا شاخ پر لہلہاتے ہوئے رنگین پھول میں اور خوبصورت گلدان کے کملائے ہوئے پھول میں؟ اب تو وہ ایک لڑکی تھی معمولی ـــــــ ویسی ہی جیسی بیسیوں محل میں بھری پڑی تھیں +

شہزادے کا دل ایک قاتل کی سی پشیمانی محسوس کر رہا تھا +

اور سب سے پہلی بات جو شہزادے کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں تک آئی وہ جانے کی اجازت کی درخواست تھی ـــــــ وُہی آزادی کی پرانی خواہش، وُہی بغیر انجام کو سوچے سمجھے، پائے ہوئے کو کھونے کی طفلانہ تمنا +

جس سرعت کے ساتھ شہزادے نے پہاڑی لڑکی کو یہاں لانے کا فیصلہ کیا تھا، اُسی سرعت کے ساتھ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے اس نامرغوب پابندی سے آزاد کر دے گا ـــــــ اس وقت وہ صرف اسے خوش کرنا چاہتا تھا ـــــــ لیکن جو اس کی خوشی تھی وہی شہزادے کی تمام امیدوں کا خاتمہ تھا ـــــــ تمام تمناؤں کی بربادی ـــــــ مگر اُسے جبراً روک کر بھی تو آج تک اُسے خوشی نصیب نہ ہوئی تھی۔ جو کھیل تقدیر نے شہزادے کے ساتھ کھیلا تھا اس میں اب صاف اُسے اپنی ہار نظر آ گئی +

بے اختیار شہزادے کے منہ سے نکلا "جاؤ اگر تم اسی میں خوش ہو میری خوشیوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے چلی جاؤ اب تمہیں کوئی جانے سے نہیں روک سکتا۔ تمہاری خوشی یہی ہے تو تم خوش ہو جاؤ" +

وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور شہزادے نے افسردہ لہجے میں کہا "کیا پہاڑوں میں جانے کے بعد پھر بھی کبھی اپنے شہزادے کو یاد کرو گی؟" وہ خاموش رہی اور شہزادے نے دوبارہ سوال کیا "کیا یہ محلوں کی زندگی اور ایک شہزادے کی مجنونانہ باتیں تمہیں پھر یاد نہ آئیں گی؟"

اُس نے جواب میں صرف سر کو ہلکی سی جنبش دی جو نہ انکار سمجھی جائے اور نہ اقرار شاید وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ "آزاد ہو کر قید کو یاد کرنا کون سی بھلی بات ہے" +

پھر خود بخود وہ شہزادے کے گراں بہا موتی اور ہیرے اپنے جسم سے علٰحدہ کرنے لگی ـــــــ اور پہلی بار شہزادے کے دل میں اپنی

بے مائیگی کا احساس پیدا ہوا۔ ایک غریب بکریاں چرانے والی نے کس سادگی سے اُس کی نظروں میں اُس کے مال و دولت کو حقیر ثابت کر دیا تھا اور بے نیازی کا ایک ایسا سبق اُس روز اس نے بے خبری میں شہزادے کو پڑھا دیا جس سے شاید عمر بھر یُوں وہ غافل رہتا +

شہزادے نے رنجیدہ ہو کر کہا "ہاں ہاں ان بے فائدہ چیزوں کو یہیں چھوڑ جاؤ جو تمہیں ایک ظالم شہزادے کی یاد دلا سکتی ہیں"+

وہ شہزادے کی اس طنز کو نہ سمجھی۔ ان چیزوں کا یہیں چھوڑ دینا تو اسے بالکل قدرتی معلوم ہو رہا تھا +

اب پھر اُس کے جسم پر اُس کا وہی پھٹا پرانا لباس تھا وہی ٹوٹے پھوٹے بھدے موتیوں اور گھونگوں کی مالا اور وُہ جا رہی تھی +

شہزادے نے رخصت کے وقت نہ اُسے الوداع کہی نہ کوئی پُر حسرت لفظ اپنی زبان سے نکالا لیکن اُس کی آخری مغموم نگاہ میں خدا جانے کونسی جادو کی تاثیر تھی کہ جنگلی لڑکی کی نگاہیں بھی خود بخود اس کے سامنے جھک گئیں اور اس کے شوق سے اُٹھتے ہوئے قدموں میں ایک لمحہ کیلئے لغزش سی آ گئی +

شہزادہ دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس اُمید پر کہ شاید ایک بار وہ پیچھے پلٹ کر دیکھے ـــــــ لیکن بیکار وہ کھڑا رہا اور اُس کی آزاد کی ہوئی چڑیا پھر سے اُڑ کر آگے نکل گئی۔

(۵)

سارے گاؤں میں اُس کی آمد کا چرچا تھا۔ اُس کی گمشدگی کے متعلق لوگ دیر سے خیال کر چکے تھے کہ اُسے پہاڑوں میں سے کوئی جن یا پری اٹھائے گئی ہے اور اب لڑکی کی "عجیب وغریب" باتیں سن کر اُن کے شبہات پر مُہر تصدیق لگ گئی +

اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھ کر اُسے گم سم پا کر عورتیں آپس میں قسم قسم کی باتیں کرتیں طرح طرح کے سنو بہانہ قصے تراش کر اس سے منسوب کرتیں اور کہتیں ہو نہ ہو ابھی آسیب نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا +

وہ کہیں سے سن چکی تھی کہ آسیب، جن، بھوت وغیرہ سب انسان کا وہم ہی وہم ہیں اور اب تو اسے خود بھی یہ باتیں صاف غلط اور وہم معلوم ہوتی تھیں، لیکن دوسروں کو کیسے وہ سمجھاتی۔ جو جو باتیں اُس کے دل میں تھیں اگر وہ انہیں سناتی یا سمجھاتی تو یہ لوگ اُسے بالکل ہی مجنون خیال کر لیتے۔ جی ہی جی میں کڑھ کر وہ خاموش ہو جاتی۔ بے خبری میں ایک بار جو کچھ اُس کے کانوں میں پڑ چکا تھا ـــ جسے اُس وقت اس نے کبھی سمجھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی اب پہلے سے بدرجہا روشن اور واضح ہو کر اُس کے دماغ میں بیدار ہو رہا تھا +

وہ حیران ہو کر سوچتی "آخر یہ لوگ کیوں اس قدر بدل گئے ہیں پہلے ان کی باتیں ایسی نہ ہوا کرتی تھیں اب ان کی سمجھ کو کیا ہو گیا" پھر وُہ اُن کی صحبت سے بھاگ کر اپنی بکریوں کو لئے ہوئے پہاڑ کی طرف نکل جاتی، لیکن اُسے معلوم ہوتا کہ ان بکریوں میں اور جنگل میں بھی اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ وہ سبزہ جسے ہمیشہ بے پروائی سے روند کر وہ گزر جایا کرتی تھی اب اس پر پہنچتے ہی خود بخود اس کے قدم جھجکنے لگتے، ایک ایک ننھے سے پھول، ایک ایک پتی کو بچا کر اسے چلنا پڑتا۔ نہ جانے کس نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ گھاس کے ایک ایک تنکے میں زندگی کی روح ہے +

جب وہ پیار سے اپنی بکریوں پر جھک کر انہیں تھپکانے لگتی تو اس کے ہاتھ کی گرفت بے پروائی سے وہیں ڈھیلی پڑ جاتی اور اس

کا خیال کہیں سے کہیں بھٹک کر شہزادے کے محل کی طرف چلا جاتا ——— بکریاں اس ماتھ کی سردی اور اجنبیت کو محسوس کرتیں اور ممیاتی ہوئی اُسے تنہا چھوڑ کر پھلانگ پھلانگ کر چٹانوں پر چڑھ جاتیں۔

پھر وہ وہیں زمین پر بیٹھ جاتی اور سوچتی "آہ کیوں میرے جانے سے سب کچھ ہی بدل گیا؟ کیوں اگلی سی ایک بات بھی نہیں رہی۔ پھر وہ دل بہلانے کی غرض سے وہیں بیٹھے بیٹھے نظر اٹھا کر کسی گھونسلے میں سے ننھے ننھے بچوں کو چونچیں باہر نکالتے ہوئے دیکھتی اور خیال کرتی کبھی میں ان گھونسلوں سے پرندوں کے انڈے اور بچے نکالا کرتی تھی ——— "ہائے کیسا ظلم تھا" ان ننھے بچوں کی بھی کوئی ماں ہوگی کوئی باپ ہوگا۔ اور اگر کوئی انہیں مار ڈالے تو وہ اُن کے لئے کتنا روئیں گے؟ ——— میری نہ ماں ہے نہ باپ پھر اگر کوئی مجھے مار ڈالے تو کون ہے جو میرے لئے روئے؟ ——— دفعتہً اس کے کان میں کوئی شہزادے کا نام لے دیتا ——— ہاں ہاں اگر کوئی مجھے مار ڈالے تو شہزادہ ضرور میرے لئے روئے ——— لیکن اُسے تو میں چھوڑ آئی ہوں ——— کیوں؟ ——— خدا جانے کیوں؟

پھر وہ چشمے کے کنارے جھک جاتی اور سوچتی کہ شہزادے کے محل میں آئینے تھے ——— میں اُن میں بھی اپنی صورت دیکھا کرتی تھی ——— "شہزادہ کیوں میری اتنی تعریفیں کرتا تھا؟ کیا واقعی میری صورت اتنی اچھی ہے؟

شام کے وقت اپنے جھونپڑے میں بیٹھ کر وہ سوچتی "خدا جانے یہ گھر اب اس قدر تاریک کیوں ہو گیا؟ کیا پہلے بھی ایسا ہی تھا؟" اور جب اس کے آقا کے بچے شرارت سے اس کے بال نوچتے اور اسے گھوڑا بن کر چلنے پر مجبور کرتے تو بے اختیار وہ رونے لگتی اس حالت میں تو بچوں کی شوخیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں جب خود میرا جی اُداس ہے ——— وہ کیوں مجھے میری مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں شہزادے کے محل میں تو کوئی میری مرضی کے خلاف آنکھ نہ اٹھا سکتا تھا"۔

جب مالکہ اُسے رونے پر ڈانٹتی تو اُسے غصہ آجاتا ——— پھر وہ خود ہی سوچتی "پہلے کبھی غصہ نہ آیا کرتا تھا؟ اب کیا بات ہے؟" اور ساتھ ہی اسے محل کی وہ تمام عورتیں یاد آجاتیں جو شہزادے کے حکم سے ہر وقت اُس کی خوشامدوں میں مصروف رہا کرتی تھیں۔

پھر اُس کا آقا وہی پرانے قصے لے بیٹھتا اور وہ پرشوق انداز سے اُسی گزشتہ دلچسپی کے تصور میں انہیں سننے کے لئے بیٹھ جاتی لیکن جلد ہی اکتا جاتی اور خیال کرتی آقا کی باتیں اب تو ویسی نہیں رہیں؛ شاید پہلی تمام دلچسپ باتیں وہ بھول چکا ہے"۔ پھر دل میں کوئی ایسا قصہ دُہرانے لگتی جو کبھی خواب کی سی حالت میں اس نے شہزادے کی زبان سے سُنا تھا۔

اس کی مالکہ چرخا کاتتے ہوئے گانا شروع کر دیتی اور وہ بے اختیار ان گیتوں کا مطلب سوچنے لگتی اور حیران ہوتی "کیا مالکہ پہلے بھی ایسے ہی بے معنی گیت گایا کرتی تھی؟ آہ اب اُس کی آواز کی وہ پرانی دلکشی کدھر گئی"؟

آخر تنگ آکر وہ سونے کے لئے آنکھیں بند کر کے اپنے بستر پر لیٹ جاتی لیکن تاریکی میں فوراً شہزادے کی آخری نگاہ اُس کی آنکھوں میں پھرنے لگتی۔ پھر وہ سوچتی "شہزادہ شاید اُس وقت بہت ہی غمگین تھا ——— شاید اس وقت بھی وہ رو رہا ہو ——— اس خیال سے بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور پھر تمام رات اُس نگاہ کا تصور اُسے سونے نہ دیتا۔

صبح جب اُس کی مالکہ اُسے دیر سے سوکر اٹھنے پر ملامت کرتی تو وہ اس خوف سے کانپ جاتی کہ کہیں مالکہ اُس کی بیداری کے بھید کو پاکر اُس کے تصورات کو اُس سے چھین نہ لے +

اب کبھی کوئی کام اُس سے درست نہ ہوتا تھا۔ بات بات پر وہ بھول جاتی۔ نہ اُسے مالکہ کی خوشنودی کا خیال تھا نہ آقا کا ڈر نہ کسی چیز سے کچھ غرض۔ دن رات وہ اپنے ہی خیالوں میں محو رہتی، دن رات شہزادے کے محل کی باتیں اُس کے دل میں چکر لگایا کرتیں +

جنگل میں ہر ذرا سی کھڑکھڑاہٹ پر، ہر ہلکی سے ہلکی آواز پر، ہر ہوا کی جنبش پر اُسے خدا جانے کیوں شہزادے کے گھوڑے کی چاپ کا شبہ ہوتا اور وہ چونک اٹھتی +

پھر وہ بکریوں کو آوارہ چھوڑ کر کسی پہاڑ کی اوٹ میں بیٹھ جاتی اور دن دن بھر یہ سوچنے میں گزار دیتی کہ کیوں اس جگہ کی ہر چیز بدل گئی ہے + کیوں مجھے کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا؟ کیوں ہر چیز سے میرا دل بیزار ہے؟ شہزادے کے محل میں تو ان چیزوں کی یاد ہر وقت مجھے بیقرار رکھتی تھی ـــــ کاش وہیں اس تبدیلی کا حال معلوم ہو جاتا ـــــ لیکن اُس محل میں بھی تو میرا دل نہ بہلتا تھا ـــــ پھر اب میں کدھر جاؤں؟

پھر وہ سوچتی "کیا واقعی یہ لوگ سچ کہتے ہیں کیا واقعی کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے؟ شہزادہ تو جادوگر نہ تھا ـــــ پھر کس نے جادو کیا؟ پھر کس نے تمام دنیا کو تبدیل کر دیا؟"

آخر اُسے شہزادے کے محل کے اُن داناؤں کا خیال آیا جو اُسے "عجیب عجیب باتیں" بتایا کرتے تھے ـــــ لیکن جادو کو تو وہ باطل کہتے تھے ـــــ پھر وہ مجھے کیا سکھانے کے لئے آتے تھے؟

علم! ہاں علم۔

اور روز بروز اُسے یقین ہوتا چلا گیا کہ وہ علم جادو سے بھی زیادہ کوئی خوفناک چیز تھی + اور سوچتے سوچتے آخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ ایک بار پھر میں شہزادے کے پاس جاؤں گی اُسے اپنا سب حال سنا کر التجا کروں گی کہ شہزادے! اُن لوگوں کو بلا اور اُن سے کہہ جو کچھ وہ مجھے سکھایا کرتے تھے اُسے واپس لیں یہ لوگ اس علم کو جادو، آسیب اور جانے کیا کیا خیال کرتے ہیں اور میں اس دن سے بڑی آفت میں پھنس گئی ہوں +

"اب تو شہزادے سے مجھے کوئی خوف معلوم نہیں ہوتا! ـــــ اور اگر اُس نے پھر مجھے وہاں رُکنا چاہا تو میں کیا کہوں گی؟ کچھ نہیں ـــــ ابھی کچھ نہیں" +

ہر روز وہ جانے کا ارادہ کرتی اور ہر روز اس ارادے کو توڑتی۔ آخر ایک شب اُس نے اپنے آقا اور اُس کی بیوی کی گفتگو سنی، وہ اب اس کے بیاہ کی فکر میں تھے اور حیران تھے کہ اس آسیب زدہ لڑکی کو کس کے پلے باندھیں؟ یہ ذکر سن کر وہ لرز گئی اور اسی صبح سب دھندوں کو چھوڑ کر وہ چپکے سے شہزادے کے محل کی جانب چل نکلی +

دوپہر کے وقت خزاں کی سرد ہوا کے تیز جھونکے اُس بکھرے اور بالوں کو مَس کرتے ہوئے اُس کے سر پر سے ہو کر گزر جاتے اور ان کی افسردہ سائیں سائیں میں ایک اندوہناک کہانی بکھری ہوئی محسوس ہوتی ـــــ ناکام محبت کی حسرت و حرماں میں ڈوبی ہوئی اُداس کہانی ـــــ اور پھر ہوا کی غمناک رنگینیوں سے خوفزدہ ہو کر وہ اپنے کانوں کو زور سے جھٹکتی اور تیزی سے آگے بڑھ جاتی +

جوں جوں وہ شہزادے کے شہر کے قریب پہنچتی اُتنا ہی پھر واپس پلٹ کر جانا اُسے دشوار معلوم ہوتا ـــــ کیسے اب میں پھر اُن نادان لوگوں کی پھبتیاں سہہ سکوں گی جو خود اپنے وہم کا شکار ہو رہے ہیں ـــــ کیسے پھر اُس تاریک گھر میں جا کر رہ سکوں گی؟ ـــــ کیسے میں مالکہ کے بچوں کی غلیظ کام کروں گی؟ ان کی نامرغوب شرارتوں سے تو میں تنگ آچکی ہوں ـــــ اور بکریوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تو میرے تلوے بھی زخمی ہو چکے ہیں آخر کب تک میں یوں بے کار ماری ماری پھروں گی؟ ـــــ آقا کی جھڑکیاں اور مالکہ کے کوسنے اب تو میں برداشت نہ کر سکوں گی" ـــــ

راستے میں وہ بالکل ہی بھول گئی کہ گھر سے کیا سوچ کر روانہ ہوئی تھی ـــــ اب تو اُس کا مقصد صرف شہزادے سے باتیں کرنا تھا ـــــ "اتنی باتیں جو کبھی ختم نہ ہوں ـــــ شہزادہ ہمیشہ اُسکے بات نہ کرنے کا شاکی رہتا تھا اُس زمانے میں جب وہ کوئی بات کرنا جانتی ہی نہ تھی ـــــ لیکن اب اتنی باتیں سوچ کر وہ آئی تھی جنہیں سنتے سنتے شہزادہ تھک جائے ـــــ اور وہ ختم نہ ہوں۔ پھر دوسرا دن ہو پھر رات ـــــ اور پھر دن ـــــ اور آخر کار یونہی سارے دن گزر جائیں"۔

"شہزادہ میری ناگہاں آمد سے کس قدر خوش ہوگا؟" یہ سوچ کر خوشی سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھتا اور وہ مُسکرانے لگتی +

آخر وہ شہزادے کے شہر میں سے گزرنے لگی ـــــ ایک دفعہ کس شان کے ساتھ شہزادہ مجھے اپنے ساتھ لے کر یہاں سے گزرا تھا" اور اس خیال کے آتے ہی وہ خود بخود غرور سے تن کر سیدھی ہو گئی +

پھر اُس نے خیال کیا کہ آج شہزادے کا شہر پہلے سے بہت زیادہ خوبصورت اور بارونق معلوم ہو رہا ہے ـــــ "کہیں شہزادے نے میری آمد کا حال پہلے ہی سے تو نہیں معلوم کر لیا؟"

(۶)

چوبدار نے اسے دروازے سے باہر روک لیا اور درشت لہجے میں کہا "کیوں، کیوں، اب کس لئے آئی ہو؟"

اس اندازِ مخاطبت پر حیران ہو کر اس نے چوبدار کے چہرے کی طرف دیکھا اور شہزادے کا نام لے کر پھر وہ آگے بڑھنے لگی +

چوبدار نے اُسے سختی سے روکتے ہوئے ایک تضحیک آمیز ہنسی ہنس کر کہا "شہزادہ اب تم سے کبھی نہیں ملے گا +

کیوں؟؟؟

چوبدار نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے جواب میں صرف اُسی کے سوال کو دُہرا دیا "کیوں"؟

پھر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اُس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہنا شروع کیا "پھر کون شہزادے کو میرا حال بتائے میں بڑے دکھ میں ہوں ... میں تو شہزادے کے پاس فریاد لے کر آئی تھی ..... شہزادے کے وہ آدمی کہاں ہیں جو مجھے علم سکھایا کرتے تھے ..... مجھ سے اب کوئی کام نہیں ہو سکتا ... سب مجھ سے ناخوش ہیں .... اور ہر ایک مجھے ملامت کرتا ہے .... کہیں میرا دل نہیں لگتا ..... میں لوگوں سے خوف کھاتی ہوں ..... اور لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں ..... وہ سمجھتے ہیں کہ مجھے آسیب چمٹ گیا .... اور میری بکریاں بھی مجھ سے خوف کھا کر اب دُور دُور بھاگ جاتی ہیں ....

چوبدار جو محل سے آتی ہوئی نفیریوں اور باجوں کی آواز سننے میں محو ہو چکا تھا اس کا صرف آخری فقرہ سُن کر درشتی سے بولا "فریبی

لڑکی! اب شہزادے کو تجھ سے اور تیری منحوس بکریوں سے کیا کام"؟ خدا کے لئے یہاں سے بھاگ جا! آج بڑی آرزوؤں کے بعد ہمارے شہزادے کی شادی کا دن آیا ہے"۔

"شادی؟ کس کی؟ شہزادے کی شادی ـــــــ عین اُس وقت اُسے یاد آیا شہزادہ کہا کرتا تھا "میں کسی اور سے شادی نہ کروں گا" ـــــــ اور اب اُس نے شادی کر لی ہے"؟

پھر دفعتہً اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ شہزادی آ گئی جو محل میں ایک خوبصورت ناگن کی طرح اُسے گھورا کرتی تھی ـــــــ اور یک بیک نادان لڑکی سی وہ ایک سمجھدار عورت بن گئی اور رقابت کے جوش کا ایک طوفان اس کے سینے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"شہزادے نے کس سے شادی کی ہے"؟

چوبدار نے دلی احترام کے ساتھ اُسی خوبصورت لڑکی کا نام اُس کے سامنے لیا ـــــــ اور دوبارہ درد کی ایک ٹیس اُس کے پہلو میں اُٹھی۔

پھر وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اب وہ علم جو اسے شہزادے کے آدمیوں نے سکھایا تھا اسے جان سے بھی زیادہ عزیز معلوم ہُوا ـــــــ آخر شہزادے کی دی ہوئی کوئی چیز تو اب بھی اُس کے پاس موجود تھی"۔

اُس نے چوبدار سے کہا جب تم شہزادے سے ملو تو اسے بتا دینا کہ پہاڑی لڑکی آئی تھی ـــــــ صرف یہ کہنے کے لئے کہ وہ اپنے شہزادے کو ہمیشہ یاد رکھے گی ـــــــ اور پہاڑوں میں جانے کے بعد کبھی ایک دم کے لئے بھی اُسے نہیں بھولی"۔

چوبدار نے بے پروائی سے کہا "ہشت! کیا شور مچا رکھا ہے کچھ سننے بھی دو گی یا نہیں؟ اور شادی کا جلوس دیکھنے کے لئے آگے نکل گیا۔

شاید عمر میں پہلی مرتبہ موت کی شدید خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوئی اور پھر وہ واپس جا رہی تھی ـــــــ تھکی ہوئی اور آہستہ آہستہ ـــــــ اور ہر قدم پر ایک بار پیچھے پلٹ کر نگاہ ڈالتی تھی کہ شاید شہزادہ اسے جاتے کہیں سے دیکھ رہا ہو ـــــــ شاید ایک بار پھر شہزادے کا چہرہ نظر آ جائے ـــــــ شاید وُہ پھر ایک ویسی ہی نگاہ ڈالے جس کا تصور راتوں کو اُسے بیدار رکھتا تھا ـــــــ اور جو اب بھی ویسے ہی اُس کی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔

"راہرو"

گلچیں

مشہور فرانسیسی ڈرامانگار مولیئر سے کسی نے پوچھا "اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض ملکوں میں شہزادہ چودہ سال کی عمر میں بادشاہ بن سکتا ہے لیکن اٹھارہ سال تک شادی نہیں کر سکتا"؟ اُس نے جواب دیا "اس کا سبب ظاہر ہے۔ ایک بیوی کو قابو میں رکھنا ایک مُلک پر حکومت کرنے سے زیادہ مشکل ہے"۔

افسانہ کیلئے مواد کی فراہمی

انسان کو اپنے ہم جنسوں کے حالات اور واقعات سے فطری دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لئے ہر ملک میں تاریخ اور افسانہ بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ لیکن ثانی الذکر کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ اول الذکر کو نصیب نہیں - بات یہ ہے کہ مؤرخ حقیقت و صداقت کا جویا ہوتا ہے۔ تاریخ میں کسی خاص فرد بشر یا جماعت یا قوم کے حالات من وعن بیان کئے جاتے ہیں۔ دنیا دار العمل ہے دار الجزا نہیں۔ بسا اوقات یہاں ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو سراسر ناروا معلوم ہوتے ہیں اور جن سے انسان کے احساس عدل کو ٹھیس لگتی ہے۔ مؤرخ کو یہ تمام واقعات بلاکم وکاست بیان کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن افسانہ نویس کا موقلم آزاد ہے۔ وہ اپنی تصویروں میں تخیل کا رنگ بھر کر انہیں نہایت دلکش بنا سکتا ہے۔ وہ انفرادی واقعات کے بجائے زندگی کی عالمگیر صداقتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ اشخاص قصہ کو اخلاقی عدالت سے سزا یا جزا دلا کر سامع کے احساس عدل کو مطمئن کر سکتا ہے۔ تاریخ میں ایسے واقعات بیان ہوتے ہیں جو صرف ایک بار پیش آ چکے ہیں۔ اور جو کسی فرد واحد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن افسانے کے واقعات عام انسانی زندگی کے مطابق ہوتے ہیں اور بار بار پیش آ سکتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ تاریخ میں بجز نام اور مقام کے تمام باتیں غلط ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس افسانے میں صرف نام و مقام فرضی مگر اس کے واقعات زندگی کی ہمہ گیر صداقتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ افسانے کی دلچسپی کے اور بھی بہت سے وجوہ ہیں۔ بہر حال یہ امر مسلمہ ہے کہ مرد، عورت، بچے، بوڑھے، عالم، جاہل سب کے سب افسانے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اور جس کو افسانہ سننے سے دلچسپی ہوگی اس کو افسانہ گوئی کا بھی ضرور شوق ہوگا۔ دوسری جبلات کی طرح قصہ گوئی کی جبلت بھی بچپن ہی سے انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے جس کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا موقع دینے سے وہ آگے چل کر فن کارانہ حیثیت اختیار کر سکتی ہے اور بے التفاتی و عدم استعمال کے باعث یہ چنگاری راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی دبی آخر بجھ جاتی ہے۔

تہذیب و تمدن کی ترقی نے آجکل معاشری معاملات کو نہایت پیچیدہ اور مصنوعی بنا دیا ہے۔ ایسی پیچیدہ و غیر فطری سوسائٹی میں کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے وسیع معلومات کی ضرورت ہے۔ یہ واقفیتیں نوجوانان ملک کو خارج سے بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ جس شخص کی خارجی معلومات جتنی وسیع ہوتی ہیں اتنا ہی وہ ہوشیار اور قابل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں طلبہ کے ذاتی تجربات و مشاہدات کی توسیع و ترقی کی جانب بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ اور کسی مدرسے کے نصاب تعلیم کو غور سے دیکھا جائے تو درسی کتابوں کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ ان کے مطالعہ سے خواہ یہ کتنا ہی بیزار کن کیوں نہ ہو زیادہ سے زیادہ خارجی معلومات حاصل کر سکیں۔ لیکن اسی گرانبار درسیات کے نیچے طلبہ کی ذہنی اپج اور اختراع و ایجاد کا مادہ دب کر ہمیشہ کے لئے

سلب ہوجاتا ہے ۔ آجکل کے طالب علموں کا دماغ گیا ہے اچھا خاصا ریکا ٹھیلا یا عمرو عیار کی زنبیل ہے جس میں انواع واقسام کی الم غلم چیزیں بھردی جاتی ہیں ۔ حالانکہ دماغ کی حیثیت ایک زندہ نامیاتی ہستی کی سی ہے ۔ جس کو مناسب تغذیہ وتقویت اور پرورش و پرداخت کی ضرورت ہے ۔ تاکہ وہ باطن سے ابھر کر اچھی طرح نشوونما پائے اور آگے چل کر خوشنما اور مفید پھول پھل لائے ۔ مسز اینی بیسنٹ نے آجکل کے فارغ التحصیل مدارس طلبہ کی مثال اُس دیا سلائی سے دی ہے ۔ جو صرف ڈبیا کے پہلو پر رگڑ کھانے سے روشن ہوتی ہے حقیقت میں یہاں کے گریجوایٹ صرف اِنہیں مضامین پر کسی حد تک آزادانہ بحث کر سکتے ہیں جن کے متعلق وہ کالج میں تعلیم پا چکے ہیں ۔ ورنہ وہ زندگی کے دوسرے اہم معاملات پر رائے زنی کی بہت کم صلاحیت رکھتے ہیں ۔ دراصل یہ موجودہ نظام تعلیم کا قصور ہے ۔ ہندوستانی مدارس میں مضمون نویسی پر کسی حد تک زور دیا جاتا ہے محض اس لئے کہ امتحانوں میں مضمون نویسی کے لئے خاصے نمبر مقرر ہوتے ہیں لیکن اس سے طلبہ کو حقیقی فائدہ نہیں حاصل ہوتا مضمون نویسی پر بہت سی کتابیں بازار میں بکتی ہیں ۔ لڑکے انہیں خرید کر مشہور مضامین یاد کر لیتے ہیں اور امتحان گاہ میں جاکر نگلی ہوئی باتیں اُگل دیتے ہیں ۔ غرض کہ طلبہ کے لکھے ہوئے مضامین میں زیادہ تر دوسروں ہی کے خیالات ہوتے ہیں ۔ امریکہ کے مدارس کی طرح اگر یہاں بھی مضمون نویسی کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کی تعلیم دی جاتی تو طلبہ کو اپنی جودتِ طبع اور ذہنی اُپج کے اظہار کا موقع ملتا ۔ مگر ہمارے ملک میں تو فرزندانِ وطن کے ذہنی اُفق کی فراخی و کشادگی کے لئے اہلِ جامعہ اس قدر بیچین نظر آتے ہیں کہ وہ اُن کے سامنے تمام گذشتہ انسانی تجربات کا بے انتہا ذخیرہ پیش کر دیتے ہیں جس سے طلبہ کی ذاتی تحقیق وتفتیش اور ایجاد واختراع کی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں ۔ بعض مدارس میں اگر قصہ نویسی کی نام نہاد تعلیم کا دعویٰ کیا بھی جاتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ لڑکوں کے سامنے کوئی قصہ پڑھ دیا جاتا ہے اور اُن کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس کا خلاصہ لکھ لائیں ۔ استاد طلبہ کی تحریر کے نحوی اسقام اور روزمرہ ومحاورات کی غلطیوں کی اصلاح کر دیتا ہے ۔ لیکن یہ زبان دانی کی تعلیم ہوئی نہ کہ قصہ نویسی کی ۔ الغرض ہمارے یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں باضابطہ افسانہ نگاری کی تعلیم یکسر مفقود ہے ۔

موجودہ زمانے میں معاشری معاملات کی پیچیدگی ، معیارِ حیات کی بلندی ، ضروریاتِ زندگی کے اضافے ، کاروباری مقابلہ ومسابقت ، اقتصادی جدوجہد اور پیکار کی عام ہنگامہ آرائیوں نے انسان کو نہایت عدیم الفرصت بنا دیا ہے ۔ اب انسان کو پہلے زمانے کی سی بے فکری اور فارغ البالی کہاں نصیب کہ وہ آرام واطمینان سے بیٹھا بیٹھا داستانِ امیر حمزہ ، طلسمِ ہوشربا فسانۂ آزاد اور اسی قسم کے دوسرے ضخیم ناول اور افسانے مزے لے لے کر پڑھا کرے ۔ آج کل زندگی کے مخصوص دَرد سروں سے چھٹکارا پا کر ایک عام آدمی زیادہ سے زیادہ گھنٹہ پون گھنٹہ مطالعہ کے لئے وقف کر سکتا ہے ۔ ایسے ہنگامہ پرور زمانے میں مختصر قصوں اور افسانوں کا فروغ پانا قدرتی بات ہے ۔ عوام کو اپنی کم فرصتی کے باعث اور خواص کو اپنی مشقت گریزی کی وجہ سے ایسے مائدۂ ادب کی تلاش ہوتی ہے جس کی کامل لذت بخشی صرف ایک نشست کی متقاضی ہو ۔ یہ ضرورت مختصر افسانوں سے بوجہِ احسن پوری ہوتی ہے ۔ ملک کے رسائل وجرائد نے اِن کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے ۔ یوں تو ماہانہ اور

ہفتہ وار جرائد کے ہر پرچے میں افسانے کا عنصر غالب ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر رسالے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ خاص فسانہ نمبر نکالنے لگے ہیں جن کی صوری و معنوی خوبیاں ہر خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ جب نوجوان طلبہ ان دلآویز افسانوں کو پڑھتے ہیں تو قدرتی طور پر اُن کے دلوں میں افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن اسکول یا کالج میں اس کی مطلق تربیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام اُن کو بڑا کٹھن معلوم ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح قصہ گوئی کا عظیم الشان موضوع بھی انسانی زندگی کے واقعات و معاملات ہیں۔ علومِ طبیعیہ جن کا موضوعِ بحث ہوا، پانی، مادہ، روشنی، بجلی اور دوسرے قدرتی اشیا و مناظر ہوتے ہیں دلچسپی اور تفریح کے لحاظ سے علومِ بشریہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو خاص انسان اور اُس کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان کائنات کا مرکز ہے۔ تمام قدرتی اشیا اسی مرکز کے گرد چکر کاٹتی ہیں۔ اس کے آگے سورج، چاند، ستارے سب مسخر ہیں۔ افسانوں کے پلاٹ اسی مرکز سے وابستہ ہوتے ہیں۔ بغیر کردار کے کوئی قصہ معرضِ وجود میں نہیں آسکتا، لیکن ہمارے مدارس کے طلبہ کو حیاتِ انسانی کے بلاواسطہ مطالعہ کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ وہ محض کتابی معلومات پر بھروسا کرنے اور دوسروں کے خیالات و آراء کو شمعِ راہ بنانے کے عادی ہوجاتے ہیں، حالانکہ کوئی شخص اس وقت تک اعلیٰ درجے کا فن کار یا بلند پایہ افسانہ نگار نہیں بن سکتا جب تک اُس میں اپنے گرد و پیش کے واقعات اور انسانی زندگی کے معاملات پر آزادانہ غور و فکر کرنے کی قابلیت نہ پائی جائے یہی قابلیت ایک قادرِ فن صناع (آرٹسٹ) کو دوسرے بنی نوعِ انسان سے ممتاز کرتی ہے۔ نوجوان طلبہ کی نظر میں افسانہ نگاری کی دشواری کی دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اُن کو فطرتاً تعجب خیز، ہیجان انگیز اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن سنسنی پیدا کرنے والے مہماتی و ہفت خوانی قصے بالعموم دور دراز ملکوں، طوفانی سمندروں، لق و دق صحراؤں، مہیب جنگلوں، خوفناک پہاڑوں اور خطرناک جنگلی قوموں کے واقعات و تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس لئے نوعمر طالب علم سمجھتے ہیں کہ لمبے چوڑے سفر کرنے اور مختلف قسم کے خطرات کا مقابلہ کئے بغیر افسانہ نویسی کے لئے دلچسپ مواد فراہم ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف ممالک کی سیاحت یا بحری سفر کے ذریعے سے اپنی معلومات میں وسعت اور تجربات میں اضافہ کرنا بہت مفید چیز ہے لیکن افسانہ نویسی کی یہ لازمی شرط نہیں ہے۔ اس امر کی مطلق ضرورت نہیں کہ واقعاتِ زندگی و معاملاتِ حیات کا براہِ راست تجربہ حاصل کرنے کے لئے کوئی متعلم اپنا اسکول یا کالج چھوڑ کر ترکستان یا جاپان چلا جائے، یا بحرِ شمالی و بحرِ اوقیانوس کا آبی سفر اختیار کرے، یا افریقہ کے بیابان میں جاکر ریت کا طوفان دیکھے، یا کوہِ ایورسٹ کی چڑھائی کی مہم میں شریک ہو، یا آسٹریلیا کے وحشیوں میں رہ کر اُن کے طرزِ بود و ماند کے متعلق واقفیت حاصل کرے۔ بلکہ ہر شخص محض اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات سے افسانہ نویسی کے لئے وافر مواد فراہم کرسکتا ہے بشرطیکہ اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ اس کی ماحولی زندگی میں کون کون سی چیزیں ڈرامائی دلچسپی سے مملو ہیں۔ جو لوگ صاحبِ کمال کہلاتے ہیں اُن میں بالعموم دو خوبیاں پائی جاتی ہیں اول یہ کہ وہ زندگی کے معمولی واقعات و معاملات میں ڈرامائی عنصر دریافت کرلینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ دوم یہ کہ وہ جو کچھ دیکھتے

اور دریافت کرتے ہیں اسے مؤثر الفاظ میں بیان کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے شائقین کو چاہیئے۔ کہ وہ اپنے ماحول کی زندگی میں ڈرامائی عناصر کی تلاش کریں یہی ڈرامائی عناصر قصہ نویسی کے لئے بہترین مواد ثابت ہونگے۔ لیکن ڈرامائی عناصر کی پہچان کیا ہے؟ جس طرح شیشۂ منشور کی مدد سے آفتاب کی بظاہر سفید روشنی قوسِ قزح کے سات رنگوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے اسی طرح حیاتِ انسانی کا ڈرامائی حصہ نفسیات کی مدد سے پانچ اجزا میں تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ طلبہ کو اپنی استعداد کے مطابق اپنی ماحولی زندگی میں اُن پانچ اجزا کا کھوج لگانا چاہیئے۔ انھیں اجزا کو ڈرامائی عناصر بھی کہتے ہیں اور وہ حسبِ ذیل ہیں:-

پہلا عنصر "عمل و حرکت" ہے۔ ہر عمل، ہر کام، ہر فعل میں حرکت پائی جاتی ہے۔ خود زندگی کا مدار حرکت پر ہے ورنہ سکون و جمود موت کے مرادف ہے۔ حرکت میں برکت ہے اور برکت کسے پسند نہیں؟ تم جہاں حرکت دیکھو سمجھ لو کہ وہاں ڈرامائی دلچسپی کا ہیولیٰ موجود ہے۔ کون شخص ایسا ہوگا جو مختلف ملکوں کی سیاحت، سیر و شکار، سراغ رسانی، پہاڑ کی چڑھائی اور سات سمندروں کے بحری سفر کے حیرت انگیز واقعات و حالات میں دلچسپی محسوس نہ کرتا ہو؟ جب کوئی شاندار جلوس نکلتا ہے یا میلوں ٹھیلوں میں آدمیوں کا ہجوم حرکت کرتا ہے یا کوئی پلٹن میدان میں پریڈ کرتی ہے یا ہرنوں کی جماعت کھیتوں میں چوکڑی بھرتی ہے، یا گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑتے ہیں یا چکوروں کی ٹکڑی ہمارے سروں کے اوپر سے اڑی جاتی ہے تو کیا ہم تھوڑی دیر ٹھہر کر اُن کا تماشا دیکھنے نہیں لگتے اور اس تماشے سے محظوظ نہیں ہوتے؟ جو طالبِ علم عمل و حرکت میں دلچسپی محسوس کرتا ہے وہ زندگی کا پہلا ڈرامائی عنصر دریافت کرنے کی فطری صلاحیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اردو کے رسائل و جرائد آئے دن بیسیوں افسانے شائع کرتے رہتے ہیں اور بعض مصنفوں نے اپنے افسانوں کے مجموعے کتابی شکل میں چھپوائے بھی ہیں تاہم اُن کی کم عیاری مسلم ہے۔ اردو میں ابھی باکمال افسانہ نگاروں کا کال ہے۔ اُردو شاعری کی طرح اُردو افسانہ نویسی ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی ہے۔ ہماری شاعری صرف پایۂ تکمیل ہی کو نہیں بلکہ معراجِ کمال کو پہنچ گئی ہے لیکن اُردو افسانہ نگاری ابھی ارتقا کے ابتدائی منازل طے کر رہی ہے۔ یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس افسانہ نویس کو کون سے ڈرامائی عنصر کی دریافت اور اُس کے استعمال میں خاص مہارت حاصل ہے۔ مختصر افسانہ نویسی کا موجودہ فن مغربی دنیا کی ایجاد ہے۔ وہاں اس فن نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس کے متعلق ہر بات کا حوالہ اور ہر شے کی مثال بہ آسانی دستیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ پہلے ڈرامائی عنصر یعنی "عمل و حرکت" کے دلدادوں میں اسکاٹ، کوپر، اسٹیونسن، ہارڈی، جیک لنڈن اور کپلنگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس ڈرامائی عنصر کی دریافت کا ان کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ مہماتی قصوں یا ہفت خوانی افسانوں میں "عمل و حرکت" کا عنصر خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے۔

دوسرا اہم عنصر "شدتِ جذبہ" ہے۔ زندگی کے شدید لمحات کے مشاہدے میں بھی ڈرامائی دلچسپی پائی جاتی ہے۔ جب کوئی متعلم پہلے سرکاری امتحان میں کامیاب ہوتا ہے یا جب اُسے سالانہ جلسہ میں کوئی انعام ملتا ہے یا جب وہ کوئی بازی کی شرط جیتتا ہے، یا جب وہ اپنی ٹولی (ٹیم) کا کپتان مقرر ہوتا ہے یا جب اُس کا پہلا مضمون کسی رسالے میں چھپتا ہے اُس وقت اُس کے جذبات کی شدت، انتہائی مسرت اور دلی کیفیت قابلِ دید ہوتی ہے۔ اسی طرح ناکامی و مایوسی کے وقت اُس کے کرب و الم کے

شدید جذبات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب عاشق کو معشوق کا پہلا خط وصول ہوتا ہے، جب کسی ساہوکار کا دیوالہ نکلنے کا موقع آتا ہے، جب کسی مجرم کا جرم فاش ہوجاتا ہے، جب کوئی مجاہدِ قوم ہتھیلی پر سر رکھ کر میدان میں آتا ہے، جب کسی بادشاہ کو اُس کی فوج کی شکست کی اطلاع ملتی ہے، جب ولایت سے والدین کے پاس تار آتا ہے کہ اُن کا لڑکا سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ کیا اُس وقت اُن کے جذبات کا تلاطم، دل کا دھڑکا اور ہیجانی کیفیت ملاحظے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ سب زندگی کے شدید مواقع ہیں۔ ان ڈرامائی لمحات کا مطالعہ افسانوں کے لئے بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔ جن افسانہ نگاروں کی تصنیفات میں زندگی کے شدید لمحات اور شدتِ جذبات کے شواہد بکثرت پائے جاتے ہیں ان میں ایڈگر ایلن پو، ہارتھورن، موپساں، کانرڈ، ڈاس ٹسکی، اور ہیوگو بہت مشہور ہیں۔

تیسرا عنصر "سبب و نتیجہ" ہے۔ جو شخص کوئی واقعہ یا نشان دیکھ کر اس کے علل و اسباب دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا ملک کے معاشرتی و سیاسی واقعات کے مطالعے سے آئندہ عواقب و نتائج کی پیش بینی کرسکتا ہے اس میں قصہ نویسی کا مادہ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ سراغ رسانی کے دلچسپ افسانے بالعموم "اسباب و نتائج" ہی کی دریافت کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔ مدرسے کے لڑکوں نے اپنی درسی کتاب میں یہ مشہور قصہ پڑھا ہوگا کہ عرب کے بیابان میں ایک درویش سفر کررہا تھا۔ سامنے سے اُس کو دو سوداگر آتے ہوئے ملے جو سخت پریشان معلوم ہورہے تھے۔ درویش نے اُن سے پوچھا کہ کیا تمہارا اونٹ گم ہوگیا ہے؟ اُنہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر درویش نے دریافت کیا کہ کیا تمہارا گم شدہ اونٹ داہنی آنکھ کا کانا اور ایک پاؤں کا لنگڑا تھا؟ کیا اُس کے آگے کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے؟ کیا اُس پر ایک طرف گیہوں اور دوسری طرف شہد لدا ہوا تھا؟ سوداگروں نے خوش ہوکر کہا کہ ہاں ہاں تم نے اس کا ٹھیک حلیہ بیان کیا۔ اب جلد بتاؤ کہ وہ اونٹ کہاں ہے؟ جب درویش نے جواب دیا کہ میں نے تمہارا اونٹ نہیں دیکھا ہے تو اُن کی حیرت اور غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اُسے پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے جہاں درویش نے نہایت واضح طور پر تمام امور کی تشریح کی اور بتایا کہ کس طرح اُس نے درخت کی ٹہنیوں، گھاس کے گچھوں، پاؤں کے نشانات، چیونٹیوں اور مکھیوں کے اجتماع وغیرہ سے گم شدہ اونٹ کے متعلق قیاسات قائم کئے تھے۔ قاضی اور تمام اہلِ عدالت درویش کے تشریحی بیان سے نہایت محظوظ ہوئے اور سب نے اس کی زیرکی اور دانائی کی تعریف کی۔ درویش نے جو کچھ دیکھا تھا اگر وہ اس کو من و عن بیان کردیتا اور نتائج اخذ نہ کرتا تو کوئی پر لطف قصہ معرضِ وجود میں نہ آتا۔ یہاں درویش کے استدلال اور نتائج اخذ کرنے کا طریقہ اصل دلچسپی کی چیز ہے۔

اس مثال سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا میں واقعات و معاملات جس طرح پیش آتے ہیں اسی طرح اُن کو بے کم و کاست بیان کر دینے سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی بلکہ بیان کا ڈرامائی طریقہ اس امر کا متقاضی ہے کہ جو واقعات و آثار مشاہدہ میں آئیں ان کے اسباب و نتائج کی درمیانی کڑیوں کو باہم ملانے کی کوشش کی جائے۔ علت و معلول یا سبب و نتیجہ کی دریافت زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ کو نہایت پر اسرار و معنی خیز بنادیتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک لمبی داڑھی والے مولوی مجمع میں وعظ کہہ رہے ہیں۔ سارا مجمع خاموش ہے اُن پر وعظ کا کوئی خاص اثر ظاہر نہیں ہوتا لیکن ایک شخص زار و قطار رو رہا ہے۔ کیا تم اُس کے رونے کی وجہ بتا سکتے ہو؟ شیام لال سیٹھ

کسی کاروباری ضرورت سے بمبئی گیا ہوا ہے۔ اس کے مکان میں کوئی جوان مرد نہیں ہے۔ ایک نوجوان صبح وشام وہاں کوچہ گردی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب مکان سے خادمہ نکلتی ہے تو وہ اُس کی خوشامد کرتا ہے اور کچھ تحفے بھی پیش کرتا ہے۔ کیا تم اس نوجوان کی حرکات کی توجیہ کر سکتے ہو؟ چاندنی رات میں سڑک کے کنارے دو شخص بہت دیر سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ جب کوئی اُن کے نزدیک سے گذرتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ کیا تم اُن کا راز جاننے کے لئے بے چینی محسوس کرتے ہو؟ ایک شخص نگار خانے کے ایک ہی کمرہ میں ہر روز جایا کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نہ تو قلم ہوتا ہے نہ پردۂ تصویر۔ وہ کسی سے کچھ باتیں بھی نہیں کرتا۔ خاموش آتا اور خاموش چلا جاتا ہے اس سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟ ایک بوڑھی عورت قید خانے کی تاریک عمارت سے روتی ہوئی باہر آتی ہے۔ کچھ دیر مجلس کی پرہول دیوار کے نیچے کھڑی ہو کر آنسو بہاتی ہے۔ مایوسی کے عالم میں اپنے گھر واپس جاتی ہے۔ کیا تم اُس کے رونے کا سبب معلوم کر سکتے ہو؟ روزانہ زندگی میں اس قسم کے سینکڑوں واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر تم اسباب ونتائج کی درمیانی کڑیوں کو باہم مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو تو سمجھ لو کہ تم میں افسانہ نویسی کا مادّہ موجود ہے۔ "سبب ونتیجہ" کا ڈرامائی عنصر کانن ڈائل، اڈگر ایلن پو، جارج ایلیٹ اور ٹامس ہارڈی کے مختصر قصّوں اور ناولوں میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔

چوتھا اور نہایت اہم عنصر "انسانی دلچسپی" ہے۔ یوں تو ہر شخص کا مذاق اور پسند جداگانہ ہوتی ہے لیکن بعض امور اور واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن سے عام انسانی دلچسپیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ ان واقعات کو افسانے کا بہترین مواد تصور کرنا چاہیئے۔ انسانی دلچسپی کا عنصر جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی غیر واضح اور معیّن بھی ہے۔ دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں لیکن ان کی منطقی تعریف بیان نہیں کی جا سکتی۔ شاعری سے کون شخص واقف نہیں ہے؟ ہم اشعار پڑھتے ہیں اُن سے محظوظ ومتاثر ہوتے ہیں۔ اُن کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہیں۔ اُن کی تنقید یا تحسین بھی کرتے ہیں لیکن ارسطو کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی ماہرِ فن یا نقاد شاعری کی تشفی بخش منطقی تعریف پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ہر شخص اس صفت سے واقف ہے جو خیالات و واقعات اور کردار میں ڈرامائی دلچسپی پیدا کر دیتی ہے لیکن اس صفت کی توضیح وتشریح بہت مشکل امر ہے۔

آج کل مغربی دنیا کے مدبّر "انسانی دلچسپی" پر بہت زور دیتے ہیں اور اس صفت کو افسانے کا حقیقی جوہر قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب دریافت کیا جاتا ہے کہ آخر اس عنصر کی پہچان کیا ہے؟ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ کونسا واقعہ انسانی دلچسپی کا حامل ہے؟ تو نہ صرف حلقۂ ادبیات میں بلکہ دائرۂ تنقید میں بھی خاموشی چھا جاتی ہے۔ البتہ ماہرینِ نفسیات نے "توجہ" اور "دلچسپی" کے درمیان جو امتیاز قائم کیا ہے وہ اہمیت سے خالی نہیں۔ پہلے لوگ توجہ اور دلچسپی کو باہم مرادف خیال کرتے تھے لیکن فی الحقیقت ان کے درمیان وسیع خلیج حائل ہے۔ توجہ کے وقت انسان کی حیثیت انفعالی اور دلچسپی کے موقع پر فاعلی ہوتی ہے۔ کسی اچانک دھماکے یا بجلی کی کڑک کی آواز سن کر ہماری توجہ خود بخود اُس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ گویا توجہ ایک غیر اختیاری فعل ہے۔ لیکن کوئی چیز ہماری دلچسپی کو ہماری خواہش کے خلاف زبردستی اپنی جانب مائل نہیں کر سکتی۔ دلچسپی کا احساس ہماری قوتِ ارادی کے تابع ہے۔ کوئی شے ہماری توجہ کو اضطراراً جلب کرتی ہے لیکن کسی امر سے دلچسپی ہم سوچ سمجھ کر حاصل کرتے ہیں۔ بغرض کہ دلچسپ چیز ہمارے غور وفکر کی محتاج ہوتی ہے۔

فرض کرو کہ تم کسی سرکس میں ایک ایکٹر کو اونچے تار پر چلتے، تھرکتے اور کئی قسم کے کرتب کرتے ہوئے دیکھتے ہو اگر تم کو اس تماشے سے گہری دلچسپی ہو تو صرف تمہاری توجہ ہی اُس جانب مبذول نہ ہو گی بلکہ تم کو حیرت ہو گی کہ وہ تار پر اپنا توازن کیسے قائم کرتا ہے۔ تم کو انتظار ہو گا کہ دیکھیں ایک کرتب کے بعد وہ دوسرا کونسا کرتب کرتا ہے۔ تم کو خوف ہو گا کہ کہیں وہ نیچے گر کر اپنے ہاتھ پاؤں نہ توڑ لے۔ تم اُس کی ایک ایک حرکت پر غور کرو گے اس طرح تمہارے دل میں خیالات و جذبات کا ایک سلسلہ قائم ہو جائیگا۔ بہرحال یہ تو ایک معمولی تماشے سے دلچسپی کی کیفیت تھی۔ لیکن اگر تم کو استعمار و انتداب، تاابنِ تجارت، ملکی مصنوعات کی ترقی، جبری تعلیم، آزادیٔ نسواں جیسے اہم سیاسی و معاشری مسائل سے دلچسپی ہو تو کتنے سوچ بچار سے کام لینے کی ضرورت ہو گی؟ تم کو ہر ایک معاملہ کے اسباب و نتائج، فیوض و برکات، خطرات و مشکلات، مضرات و منافع وغیرہ پر انتہائی غور و فکر کرنا ہو گا۔ الغرض نفسیاتی اصول کے مطابق جن واقعات و معاملات کے ساتھ "انسانی دلچسپی" وابستہ ہوتی ہے وہ بالعموم غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں

لیکن ہر وہ شے جو غور و فکر کی متقاضی ہو ڈرامائی دلچسپی کی حامل نہیں ہوتی مثلاً پہلے مرغی سے انڈا نکلا یا انڈے سے مرغی؟ یہ سوال بھی غور طلب ہی ہے۔ جتنے معمے، چیستان، پہیلیاں، مکرنیاں اور ریاضی کے سوالات ہیں سب کے حل کرنے میں سوچ بچار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان سے افسانہ نگاری کے لئے مفید مواد حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ عمل کا موقع پیدا نہیں کرتے۔ ڈرامائی دلچسپی کے لئے ایسے مواقع کی ضرورت ہے جہاں سوچی ہوئی تجویز عمل پر منتج ہو۔ فرض کرو کہ کوئی بہادر شاہزادہ جنگ میں دشمنوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ اپنی رہائی کے لئے مختلف تجویزیں سوچتا ہے بیسیوں تدابیر پر غور کرتا ہے لیکن اُس کا محض سوچنا اور غور کرنا دلچسپی کا محرک نہیں ہو سکتا جب تک وہ کسی تجویز پر عمل کر کے رہا نہ ہو جائے۔ پھر اس عمل کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ حیرت انگیز، غیر متوقع اور سنسنی پیدا کرنے والا ہو ورنہ سیدھی سادھی تدبیر اور معمولی و آسان عمل جس پر ہر کس و ناکس کاربند ہو سکے کبھی ڈرامائی دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا۔

لیکن طلبہ کو یا دوسرے نوجوان و نوآموز افسانہ نگاروں کو ان پیچیدہ مباحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح ہم شاعری کی نوعیت و ماہیت سے ناواقف ہونے پر بھی اچھے اور برے شعر میں تمیز کر لیتے ہیں اسی طرح "انسانی دلچسپی" کی منطقی و نفسیاتی شرائط کے جانے بغیر بھی ہر شخص فطرتاً محسوس کر لیتا ہے کہ کون سے واقعات و معاملات اور مسائل و مواقع عام طور پر دلچسپ ہوتے ہیں۔ نوجوان طلبہ اپنی اور اپنے دوستوں ہی کی زندگی سے انسانی دلچسپی کے بیسیوں واقعات انتخاب کر سکتے ہیں۔ غور کرو کہ جب تم شروع شروع کالج میں داخل ہوئے تھے تو تمہارے خیالات و جذبات کیسے تھے۔ وہ نازک موقع یاد کرو جب تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے ڈوبتے ہوئے دوست کی جان بچائی تھی۔ اسکاؤٹ کی حیثیت سے کیا تم نے کسی جلتے ہوئے مکان کی آگ بجھائی ہے؟ طاعون کے زمانے میں تم نے اپنے محلے کے ایک غریب و بیکس مریض کی کس ہمت اور بہادری سے تیمارداری کی تھی؟ جب تمہاری شادی کا پہلے پہل پیغام آیا تھا تو گھر کے آدمیوں کے سامنے تم کو کیسا حجاب محسوس ہو رہا تھا حالانکہ تمہارے دل کے اندر مسرت کی لہر دوڑ رہی تھی۔ تمہاری زندگی کے یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے واقعات گو معمولی ہیں لیکن اُن میں عام "انسانی دلچسپی" کے سامان موجود ہیں۔ زندگی کے اور بھی چھوٹے چھوٹے

معاملات میں "انسانی دلچسپی" کا مواد پایا جاتا ہے۔ کون ایسا شخص ہوگا جو کسی [illegible] گذرتے وقت بچوں کو ڈرل کرتے یا کھیلتے کودتے دیکھے اور اس کے دل میں اپنے لڑکپن کی خوشگوار یاد نہ آجائے؟ جب کوئی غریب الوطن کسی خاندان کے تمام سن و کم سن افراد کو ایک جگہ جمع ہو کر خوشیاں مناتے دیکھتا ہے تو لامحالہ اس کی چشمِ تخیل کے آگے اس کے بال بچوں کی پیاری پیاری تصویریں گھومنے لگتی ہیں۔ غرض کہ بچوں کا گیند کھیلنا، کسان کا ہل جوتنا، بوڑھی عورت کا ایک گوشے میں بیٹھ کر چرخا کاتنا، جوان مرد و عورت کا باہم اظہارِ محبت کرنا، یہ سب عام دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ جاہلوں کے اوہام و عقائد، فلسفیوں کے خبط و جنون، ملاؤں کے تعصب و تنگ نظری اور عام انسان کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ بھی افسانہ نویسی کے لئے نہایت دلچسپ مواد فراہم کرتا ہے۔ ایسے مواد کی سب سے زیادہ ضرورت کردار نگاری میں پیش آتی ہے۔ مارک ٹوین، برٹ ہارٹ اور چارلس ڈکنس نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں "انسانی دلچسپی" کے ڈرامائی عنصر کی خوب توضیح کی ہے۔

پانچواں اور سب سے زیادہ اہم عنصر "آویزش و کشاکش" ہے۔ یہ عنصر اپنی اہمیت کے لحاظ سے تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔ واضح رہے کہ کشاکش کی تین قسمیں ہیں، اول انسان کی قدرت یا نیچر کے ساتھ کشاکش، دوم انسان کی انسان کے ساتھ کشاکش، سوم ایک ہی انسان کے اندر مختلف جذبات کی کشاکش۔

(۱) **انسان کی قدرت سے کشاکش۔** ابتدائے آفرینش ہی سے انسان قدرت کے ساتھ جنگ کرتا آیا ہے۔ موجودہ تہذیب و تمدن کی عالیشان عمارت انسانی فتوحات کا نتیجہ ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے متموّل اور عیش طلب باشندوں کو صنعت و حرفت کی ترقی، کلوں اور مشینوں کی ترویج اور سائنس کے ایجادات نے قدرت کی اُن سخت گیریوں اور جابرانہ قوتوں سے بڑی حد تک مامون و محفوظ بنا دیا ہے جن کا میدانی و کوہستانی علاقوں کے باشندوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ابھی روئے زمین پر ایسی قومیں بستی ہیں جن کو بحری یا ریگستانی طوفانوں کا مقابلہ کرنا، امساکِ باراں کے زمانے میں اپنے گاڑھے پسینے سے کھیتوں کو سیراب کرنا، گھنے جنگلوں میں شیر، ریچھ، بھیڑیئے، ہاتھی اور اژدہوں سے اپنے بچاؤ کی سبیل کرنا اور بھوک سے بیتاب ہو کر سخت برف باری میں شکار تلاش کرتے پھرنا پڑتا ہے۔ بعض عالیشان محلوں کے مکینوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی نیم وحشیانہ ناشائستہ زندگی کی تگ و دو صرف عسرت زدہ طبقے کے دلوں میں سنسنی پیدا کر سکتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کا مہذب انسان ایسی جفاکشیوں اور عرق ریزیوں سے کوئی ہمدردی و دلچسپی نہیں رکھتا۔ لیکن ایسے عالیشان محلوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ دنیا کی کثیر آبادی عوام پر مشتمل ہے جن کو قدرت کے ساتھ انسانی جنگ کے کارناموں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ متوسط درجے کے لوگ قدرت کی گونگی، اندھی اور بہری قوتوں کے خلاف انسانی جدوجہد کو اُس وقت تک وقعت کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے جب تک آخری محاذِ جنگ فتح نہ ہو جائے۔ اگر ایسا زمانہ آبھی جائے جب انسان قدرت کے تمام مخالف و معاند عناصر کو تسخیر کرلے تاہم نیچر کے ساتھ آویزش و کشاکش اور جنگ و مقابلہ کے واقعات اور قصے نوجوانوں کے دلوں میں جوش، ولولہ اور سنسنی پیدا کرتے رہیں گے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا خطرات و صدمات کی جگہ ہے۔ جب تک انسان روئے زمین پر آباد ہے اس کو خطرات و مشکلات سے مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ مہماتی قصے بالعموم قدرت کے ساتھ انسانی جنگ کے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔

(۲) **انسان کی انسان سے کشاکش۔** تمام بنی نوعِ انسان ایک ہی خیال اور ایک ہی اعتقاد کے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ مختلف

مذہبی، سیاسی اور معاشری جماعتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جب دو فرقوں یا جماعتوں کے اغراض و مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں تو اُن میں آویزش و کشاکش کا رونما ہونا ایک فطری امر ہے۔ لیکن جماعتی تصادم کے علاوہ ایک ہی جماعت کے مختلف افراد بھی اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے ہیں۔ اگرچہ ہر شائستہ سوسائٹی نے اصول و ضوابط مقرر کر رکھے ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان بغیر دوسروں کی حق تلفی کئے اپنے مفاد کی تکمیل کر سکتا ہے تاہم ہر طرف حرص و آز کا بازار گرم نظر آتا ہے۔ اپنی مطلب براری کی دھن میں انسان اپنے ہم جنسوں کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس لئے آئے دن لوگوں میں مناقشات و تنازعات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر دلوں میں کھوٹ نہ ہو تو بھی مختلف جماعتیں اور مختلف افراد ایک دوسرے پر تفوق و تسابق حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ مقابلہ و مسابقت آج کل کے مادّی تہذیب و تمدن کا لازمہ ہے۔ بہرحال انسان کی باہمی کشاکش میں قصوں اور افسانوں کے وافر مواد پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے قصّوں کو اصطلاحاً معاشری قصّے کہتے ہیں۔

دو نوجوانوں کا ایک ہی عورت سے عشق و محبت کرنا، دو کاریگروں کا ایک ہی نمائش کے لئے سامان تیار کرنا، ایک ہی جائداد کے لئے کئی امیدواروں کا کوشش کرنا، دو کمپنیوں کا ایک ہی ریلوے لائن کا اجارہ حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرنا، کسی بورڈ، مجلس یا کونسل کی رکنیت کے لئے مختلف اُمیدواروں کا آپس میں مقابلہ کرنا، مانیٹر، کپتان یا عریف (Prefect) منتخب ہونے کے لئے کئی طالبعلموں کا دوڑ دھوپ کرنا۔ یہ سب انسانی آویزش و کشاکش کی چھوٹی بڑی مثالیں ہیں جن سے معاشری افسانوں کے لئے وافر مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔ عام طور پر معاشری افسانے سب سے زیادہ دلچسپ متصور ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ اُنہیں قصوں کو پسند کرتے ہیں جن میں روزانہ زندگی کے واقعات و معاملات کی توضیح و تشریح ہوتی ہے۔ جن مہماتی قصوں میں قدرتی خداوند کے خلاف مقابلہ و مجاہدہ کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ بالعموم دیہقانی اور نیم شائستہ زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے شہری اور مہذب زندگی میں زیادہ تر معاشری جد و جہد یا کاروباری مقابلہ و مسابقت کے نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس لئے تعلیم یافتہ حلقے میں معاشری افسانوں کا مقبول و ہر دلعزیز ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

لیکن زمانہ ہمیشہ آج کل کی طرح پُر امن نہ تھا۔ ایک ڈیڑھ صدی پیشتر ملک میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ راستے نہایت خطرناک تھے ہر وقت ٹھگوں اور رہزنوں کا ڈر لگا رہتا تھا۔ شہروں کے باشندوں کی بھی جان مال اور آبرو ہمیشہ خطرے میں تھی۔ پنڈاروں کی قزاقی و ہلاکت بازی سے نہ قریے محفوظ تھے نہ قصبے۔ مرہٹوں نے خود دارالسلطنتِ دہلی تک لوٹ مار پھیلا رکھی تھی۔ اس لئے اُس زمانہ میں شہر اور قصبے بالعموم فصیل بند ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کو ہر وقت اپنی حفاظت کی فکر دامن گیر رہا کرتی تھی۔ سب کو محنت و مشقت اور سخت کوشی و جفاکشی کی عادت تھی۔ ذرا سی غفلت سے نقصانِ عظیم پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اہل شہر کو آج کل کی طرح آرام طلبی و عیش پسندی نصیب نہ تھی۔ بسا اوقات اُن کو بھی مسلح بند رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے مہماتی قصوں کے واقعات اُن کی زندگی سے بے میل اور بے تعلق چیز نہ تھے بلکہ ان کے آئے دن کے تلخ تجربات کے عین مطابق تھے نتیجہ یہ تھا کہ اعلی التعلیم یافتہ طبقہ بھی مہماتی قصوں اور ہفت خوانی افسانوں سے خاصی دلچسپی رکھتا تھا لیکن بیسویں صدی کے پُر امن زمانے میں مہماتی افسانے صرف جوشیلے نوجوانوں کے دل میں سنسنی پیدا کرتے ہیں ورنہ وہ عام لوگوں کی زندگی کے

واقعات سے کوئی مناسبت یا مطابقت نہیں رکھتے۔ آج کل ہمیں قدرت کی بے محابا طاقتوں سے کوئی خوف نہیں رہا کیونکہ علوم وفنون کی ترقی نے انہیں مسخر کرلیا ہے البتہ اس دورِ مادیت میں ہمیں چھوٹے بنیچے والوں کے لگاؤ بجھاؤ سے سخت نقصان پہنچنے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ اگرچہ ملکی نظم ونسق کی خوبیوں نے ہمیں بڑی حد تک رہزنوں اور ڈاکوؤں سے محفوظ بنا دیا ہے لیکن طرح طرح کے جابرانہ اور گلو فراش محصول ہماری گاڑھی کمائی لوٹنے میں قزاقوں سے کم نہیں ہیں۔ پہلے انسان کو شیر اور بھیڑیے سے گزند پہنچتا تھا لیکن اب مذہبی تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر آئے دن سر پھٹول کے واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اس لئے آج کل ہمارے تخیلات زیادہ تر انہیں معاشرتی امور کی جانب مائل ہوتے ہیں اور انہیں سے ہمیں فطری دلچسپی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ ہماری روزانہ زندگی کے تجربہ ومشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔

(۳) **ایک ہی شخص کے دل میں مختلف جذبات کی کشاکش۔** بسا اوقات انسان کے دل میں مختلف و متضاد جذبات میں کشمکش پائی جاتی ہے نفسِ امارہ ونفسِ لوامہ یا خیر وشر کی ملکوتی اور طاغوتی قوتوں کی ستیزہ کاری سے کون شخص واقف نہیں۔ صوفیا ایک عرصہ تک ایک تکلیف دہ خلش کے ساتھ سوچتی رہی کہ وہ اپنے شوہر اینڈریے کے ساتھ نکاح کی عزت وحرمت قائم رکھے یا اپنے چاہنے والے آلین کی ناجائز محبت کو دل میں جگہ دے۔ فلک زدہ وستم رسیدہ ہیملٹ سخت کشمکش میں تھا کہ وہ مدت العمر تکالیف ومصائب جھیلتا رہے یا خودکشی کرکے تمام صدمات سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ دفعدار درگا سنگھ تین دن تک اسی حیص بیص میں رہا کہ میجر محمد علی نے جو اس کا ایک دم سے تنزل کردیا ہے وہ اس ذلت کو برداشت کرے یا پستول کے ذریعہ سے اس کا انتقام لے۔ یہ سب اندرونی جذباتی کشاکش کی مثالیں ہیں۔ جب انسان کے دل میں مختلف جذبات ستیزہ کار ہوتے ہیں تو آخیر میں جو جذبہ غالب آتا ہے وہ اسی پر عمل کربیٹھتا ہے۔ بہرحال جذبات کی آویزش وکشاکش سے بھی ایک خاص نوع کے افسانوں کے لئے وافر مواد حاصل ہوسکتا ہے۔ جو اصطلاحاً نفسیاتی افسانے کہلاتے ہیں۔

لیکن جذبات کی تحلیل وتجزیہ یا ان کی توضیح وتشریح کا مادہ اوسط درجے کے آدمیوں میں نہیں پایا جاتا۔ جذبات واحساس، خیالات ووجدانات، تاثرات وہیجانات کی کارفرمائیوں کے مطالعے کے لئے علم النفس سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ عوام کو تو ان ذہنی کیفیتوں کے وجود کا بھی علم نہیں ہوتا۔ وہ صرف ان مادی اشیا یا مرئی واقعات کا ادراک کرسکتے ہیں جو مختلف جذبات کے محرک ہوتے ہیں۔ خود مجرد جذبات کی تحلیل وتشریح کی مطلق ان میں قابلیت نہیں پائی جاتی۔ وہ انہیں معاملات سے دلچسپی رکھتے ہیں جو خود ان کی یا ان لوگوں کی زندگی میں پیش آئیں جن سے ان کو ملنے جلنے یا کاروبار کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ زید، عمر، بکر کو اپنے روزگاری مشاغل، معاشرتی معاملات اور خاندانی ذمہ واریوں کے باوجود اتنی فرصت اور لیاقت کہاں کہ وہ دماغ کے لطائف، نفس کی مختلف کیفیتوں اور جذبات کی کارفرمائیوں پر غور کرسکیں۔ اس لئے عوام کو نفسیاتی افسانوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ الغرض جن تین قسم کی کشاکشوں کا اوپر ذکر ہوا ان سے تین قسم کے افسانے معرضِ وجود میں آتے ہیں جنہیں اصطلاحاً تماتی، معاشرتی اور نفسیاتی افسانے کہتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آویزش اور کشاکش کی مذکورہ بالا بحث طلبہ اور نوآموز افسانہ نگاروں کو ذرا مشکل اور پیچیدہ معلوم ہو۔ لیکن کشاکش کے چھوٹے چھوٹے واقعات آئے دن کم عمر طالب علموں کے مشاہدے میں بھی آتے رہتے ہیں۔ کون ایسا لڑکا ہوگا جو مرغ یا بٹیر کی لڑائی، کشتی، دنگل، فٹ بال اور ہاکی کے مقابلے یا مشاعرے کی تفریحات سے دلچسپی نہ رکھتا ہو یا مدرسے کا متعلم بھی اپنے اردگرد دو حریفوں

کی کاروباری و معاشی معرکہ آرائیوں کے نظارے دیکھتا ہے۔ علاوہ بریں طلبہ کی زندگی میں جذباتی کشاکش کی بھی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک لڑکا مدرسے کی بازی گاہ پر ایک گھڑی پاتا ہے۔ اس کے دل میں اس کے ہتھیا لینے کی بُری خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مدرسے کی اخلاقی تربیت کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور دوسرے روز گھڑی کو اپنے محترم استاد کے حوالے کر دیتا ہے کہ تلاش کر کے اُسے اُس کے مالک کو دیدیں۔ جارج واشنگٹن بچپن کے زمانے میں اپنے باغ میں جاتا ہے اور خوبصورت شاہ بلوط کے درخت کو کلہاڑی سے کاٹ دیتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس کا باپ وہاں آتا ہے۔ شاہ بلوط کے درخت کی یہ حالت دیکھ کر اُسے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ جب وہ غصہ کے لہجہ میں واشنگٹن سے اس کے متعلق دریافت کرتا ہے تو سزا کا خوف لڑکے کو اخفائے جرم کی ترغیب دیتا ہے لیکن وہ اخلاقی بہادری سے کام لے کر اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے لڑکپن کا یہ واقعہ ہے کہ جب اُن کی والدہ اُنہیں تحصیلِ علم کے لئے بغداد بھیجنے لگیں تو کملی کے اندر سو دینار ٹانک دیئے اور نصیحت کی کہ بیٹا کبھی جھوٹ نہ بولنا۔ راستے میں اُن کے مختصر قافلہ کو ڈاکوؤں نے آگھیرا اور سب کی نقدی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی دریافت کیا۔ ماں کی محبت کا تقاضا تھا کہ وہ انکشافِ راز نہ کرتے لیکن انہیں ماں کی نصیحت یاد آگئی اس لئے سچ سچ بتا دیا کہ اُن کی کملی میں سو دینار ٹکے ہوئے ہیں۔ اُن کی صداقت شعاری سے ڈاکو اس قدر متاثر ہوا کہ اسی دن سے رہزنی ترک کر دی۔ ایسی جذباتی کشاکش کے بیشمار مواقع طلبا کی زندگی میں پیش آیا کرتے ہیں جس متعلم کو ان تمام امور سے دلچسپی ہو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ قدرت نے اس کو افسانہ نگاری کا مادہ ضرور عطا کیا ہے۔ دنیا کے مشاہیر مصنفین میں ہیوگو، شکسپیر، ڈوماز، جیک لنڈن اور رکس بیچ کو اس مشہور ڈرامائی عنصر یعنی آویزش و کشاکش کو اپنے ڈراموں، ناولوں اور افسانوں میں نمایاں کرنے کی بڑی مہارت حاصل ہے۔

یہ پانچوں عناصر یعنی عمل، شدتِ جذبہ، سبب و نتیجہ، انسانی دلچسپی اور کشاکش انسانی زندگی کے ڈرامائی حصہ کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اوپر ہر عنصر کی بحث کے آخیر میں مشہور مصنفوں کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں اُن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کے افسانے صرف ایک ہی عنصر پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ جس طرح قوسِ قزح کے سات رنگوں کے ملنے سے آفتاب کی روشنی بنی ہے اسی طرح پانچوں ڈرامائی عناصر کی آمیزش سے افسانے معرضِ وجود میں آتے ہیں لیکن ان میں بعض عناصر کا رنگ دھیما اور کسی خاص عنصر کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ مہماتی یا معاشرتی افسانوں میں تو عمل، شدتِ جذبہ، انسانی دلچسپی اور کشاکش کے عناصر کا رنگ مساوی طور پر شوخ اور چوکھا ہوتا ہے۔ مگر ایک سبب و نتیجہ کا عنصر ان میں ماند ہو تو ہو۔

زندگی کے ڈرامائی حصہ کی تحلیل و تشریح کے بعد غور طلب امر یہ ہے کہ افسانے کے یہ عناصر یا مواد کن کن ذرائع سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی پہچان تو اوپر بیان کر دی گئی ہے لیکن مذکورہ بالا شناخت اور نشان کی مدد سے انہیں کہاں تلاش کیا جائے۔ ماہرینِ فن کا خیال ہے کہ تین ذرائع ایسے ہیں جن سے ہر قسم کے قصوں اور افسانوں کے بیشمار پلاٹ اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل مطالعۂ باطن، دوم مشاہدہ، سوم اخبارات۔

(۱) مطالعۂ باطن۔ اگر انسان اپنی ہی گذشتہ زندگی کے واقعات اور سوانحِ حیات پر غور کرے تو اُس کو ہر قسم کے افسانے کے لئے کافی مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔ ایک نوعمر طالب علم کے ذاتی تجربات کتنے ہی محدود سہی لیکن وہ اُنہیں مختصر تجربات میں زندگی کے پانچ ڈرامائی عناصر دریافت کر سکتا ہے۔ مثلاً کسی ریلوے کے سفر یا مچھلی کے شکار میں "عمل" کے، کسی سخت طوفان سے کبھی گھِر جانے یا امتحان

ہیں ناکامی کی خبر پانے کے موقعوں پر شدتِ جذبہ کے، سستی و کاہلی کی عادت کا بُرا نتیجہ ہویدا ہونے یا محنت و توجہ کی بنا پر کوئی انعام پانے کے واقعات میں "سبب و نتیجہ" کے۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے دوست کو کسی خطرے سے بچانے یا بحیثیت اسکاؤٹ کسی مجرم کا سراغ لگانے میں "انسانی دلچسپی" کے۔ کشتی میں اپنے مدِ مقابل کو پچھاڑنے یا کئی اُمیدواروں کے خلاف جماعت کی لیڈری کے لئے جد و جہد کرنے میں "کشاکش" کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ بہرکیف بہت سے لوگ اپنی زندگی کے واقعات اپنی بیاض میں درج کرتے رہنے کی بدولت بلند پایہ افسانہ نگار بن گئے۔ انتھونی ٹرولوپ کا بیان ہے کہ مجھے دو چیزوں نے کامیاب افسانہ نگار بنایا ہے۔ ایک خیال بندی و عبارت آرائی کی مشق اور دوسری اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو روزنامچہ میں لکھ لینے کی عادت۔ ڈاڈٹ نے اپنی تالیف و تصنیف کے کام کی ابتدا اپنی طفلی کے حالات و واقعات قلم بند کرنے سے کی تھی۔ آرنلڈ بینیٹ کا خیال ہے کہ دنیا کے اکثر و بیشتر بلند پایہ افسانوں کا مواد بالعموم خود نوشت سوانح عمریوں سے ماخوذ ہے۔ ٹرجنیف کو شکار سے بڑا شوق تھا۔ وہ شکارگاہ کے تمام واقعات و تجربات قلمبند کر لینے کا عادی تھا، یہی واقعہ نگاری اُس کی آئندہ افسانہ نگاری کا پیش خیمہ تھی۔

دوسرا اہم ذریعہ "مشاہدہ" ہے۔ انسان دوسروں کے جو کچھ حالات و واقعات مشاہدہ کرتا ہے وہ بھی افسانوں کے لئے بہترین پلاٹ بن سکتے ہیں۔ ولیم ڈین ہاول کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے مکان میں کمرۂ ملاقات کے متصل ہی اپنا کتب خانہ قائم کر رکھا تھا جب کوئی ملاقاتی اُس کی بیوی سے ملنے آتا تو وہ کتب خانے میں مطالعے کے حیلے سے بیٹھا بیٹھا اُن کی گفتگو غور سے سنتا اور اسے حرف بحرف قلمبند کر لیتا تھا۔ ہاتھورن اپنے تمام مشاہدات کو اپنی بیاض میں درج کر لینے کا عادی تھا۔ ڈکنس اپنے دورانِ سفر میں جو کچھ دیکھتا اُسے لکھ لیا کرتا تھا غرض کہ جتنے بڑے بڑے افسانہ نویس گذرے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اپنے مشاہدات کے متعلق نوٹ بک (بیاض) رکھا کرتے تھے۔ ایک قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ مشاہدات کو درج کرتے رہنے کی عادت کے ساتھ ساتھ انسان کی قوتِ مشاہدہ بھی ترقی کر جاتی ہے۔ پہلے جن چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کی نظر نہیں پڑتی تھی وہ بھی آگے چل کر اس کی توجہ کی دامن کش بن جاتی ہیں۔ اور اسے ادنیٰ اور معمولی امور میں بھی دلچسپی محسوس ہونے لگتی ہے۔

تیسرا مشہور ذریعہ اخبار ہے۔ اگر کوئی شخص خاص اپنی زندگی کے واقعات و معاملات یا اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کے حدود سے باہر قدم رکھ کر ڈرامائی مواد کی تلاش کرے تو اخبارات و جرائد ہر لحاظ سے اس کے ذوقِ جستجو کی تسکین کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نو عمر طلبہ افسانہ نگاری کے شوق میں روزانہ اپنے وقت کا بڑا حصہ اخبار بینی میں ضائع کیا کریں۔ اگر وہ کبھی کبھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک افسانوی مواد کی تلاش کے لئے اخبارات کے نئے یا پرانے پلندوں کا مطالعہ کریں تو نہایت مفیدِ مطلب نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ آج کل اخبارات میں پیچیدہ سیاسی واقعات کی کثرت اور دلچسپ معاشرتی معاملات کی قلت پائی جاتی ہے لیکن طلبہ کو سیاسیات میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کے لئے معاشرتی معاملات زیادہ مفید و سبق آموز ثابت ہوں گے۔ او۔ ہنری کے افسانوں کے پلاٹ زیادہ تر اخبارات ہی سے اخذ کردہ خیالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ خود براؤننگ نے "رنگ اینڈ دی بک" کا موضوع ایک اخبار سے حاصل کیا تھا جسے اُس نے اطالیہ کے ایک کتب فروش سے خریدا تھا۔ واضح رہے کہ افسانہ نگاری اور اخبار نویسی کے اسالیب بیان میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ اخباروں میں صرف افسانوی مواد کی تلاش کریں لیکن اخباری پیرایۂ بیان کی ہرگز تقلید نہ کریں ورنہ وہ افسانہ نگار کے بجائے اخبار نویس بن جائیں گے۔

محمد حسین ادیب

جاڑے کا موسم

ونت[۱] بجے دیہنا[۲] ٹھرلاگے تاپے بن کوئی چین نہ پائی
شال دوشالہ اوڑھے چاہے اوڑھے کمل اور رزائی
آیا اب جاڑے کا موسم سن سن چلی ہوا پچھوائی[۳]

شام ہوئی سورج ہے پیلا دھوپ میں ہلکی زردی آئی
گرے کبوتر کوّے لوٹے کاؤں کاؤں ہل دھوم مچائی
پنکھ پکھیرو کریں بسیرا سن سن چلی ہوا پچھوائی

گاؤں کنارے دھواں گھرا ہے گھر میں رسوئی[۴] سب نے جلائی
روکھی سوکھی روٹی جلدی گھر والی نے گوندھ پکائی
ہاتھ پاؤں سب ٹھٹھرے جاویں سن سن چلی ہوا پچھوائی

ماتا دین، بہاری، ہیرا ہیں یہ تینوں بھائی بھائی
لمبر دار کے کھیت میں مل کے کرتے ہیں تینوں نروائی
شام کو ملتی ہے مزدوری، سن سن چلی ہوا پچھوائی

گھاس کا گٹھا سر پر رکھے ندی پار سے تینوں بھائی

---

[۱] ونت بمعنی دانت [۲] دیہنا یعنی جسم [۳] پچھوائی پچھوا ہوا [۴] باورچی خانہ

آئے اور بہن نے جلدی کٹوا ڈال چلم سلگائی
سلفہ پی کر تینوں لگا نسے ہن سن چلی ہوا پچھوائی

آگ تاپ کے بیٹھے تینوں جب تن میں کچھ گرمی آئی
ڈھول اٹھائی بہت سے چھیڑے، کبت پڑھے چوپائی گائی
جاڑا لگتا ہے تینوں کو، ہن سن چلی ہوا پچھوائی

ہنسی خوشی پھر سب نے مل کر ساگ پات سے روٹی کھائی
گدڑی اوڑھ کے پیال پہ لیٹے نیند آنکھوں میں آن سمائی
لوری چھیڑی جھینگر نے اور سن سن چلی ہوا پچھوائی

پنکھ پکھیرو کوئی نہ ڈولے، سائیں سائیں دے کان سنائی
ہوا بجاوے سیٹی بن میں، کاری رات اندھیری چھائی
نیچے اوپر ہے سناٹا، سن سن چلی ہوا پچھوائی

ایسی رات میں اے پرمیشور راس آئی کب کڑی کمائی
محنت کرنے والے نے جب پورے پیٹ نہ روٹی کھائی
اے ان داتا تیری دہائی سن سن چلی ہوا پچھوائی

سید مقبول حسین

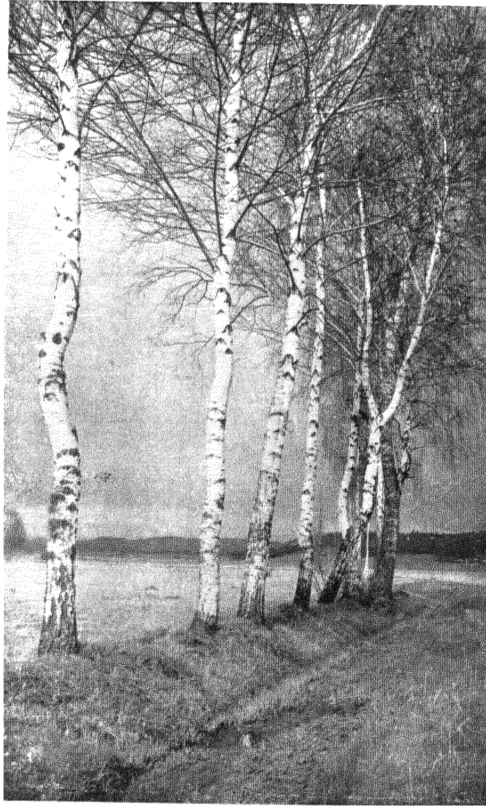
---

[1] کٹوا تمباکو جو دیسی طور گھر کی پیداوار ہوتا ہے [2] بغیر توا رکھے تمباکو پر کوئلے رکھنے کو سلفہ کہتے ہیں [3] گیتوں کے نام [4] جب اندھیری اور خاموش رات میں ہُو کا عالم ہوتا ہے تو کانوں میں سائیں سائیں کی آواز آتی ہے۔



THE HUMAYUN.

Victoria Press Lahore.



خزاں



اک دم سے بدلتی ہوئی عالم کا سماں چل — اک آگ لگاتی ہوئی لرزان و تپاں چل
جاتی ہوئی دنیائے چمن کی نگراں چل — آتی ہوئی رنگینیوں سے جلوہ فشاں چل

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! اے بادِ خزاں چل!

جس شاخ کو بل کھا کے لچکنا ہو لچک لے — جس غنچہ کو گلشن میں چٹکنا ہو چٹک لے
کچھ اور صبا کو جو سنکنا ہو سنک لے — کچھ آتشِ گل کو جو دہکنا ہو دہک لے
بدمستیوں کا دور گزر جائے گزر جائے — برگ و گل و سبزہ کا چڑھا نشہ اُتر جائے
یہ بزمِ چمن سوئے عدم خاک بسر جائے — شیرازۂ گلزار بکھر جائے بکھر جائے

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! اے بادِ خزاں چل!

پھولوں کے چراغاں کو بجھا دے تو بجھا دے — آتے ہی گلستاں میں اک اندھیر مچا دے
ہر باغ کو اک نکہتِ برباد بنا دے — گلزار کا گلزار لٹا دے تو لٹا دے

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! اے بادِ خزاں چل!

پھولے ہوئے گلزار کو ویران کیا ہے — طاؤس کو اُڑتی ہوئی ناگن نے ڈسا ہے
تو قہر ہے آفت ہے قیامت ہے بلا ہے — تو باغ میں لہرائی ہوئی برقِ فنا ہے
سوکھا جو چمن اور ہوئی شانِ گلستاں — کیا جانئے کیوں حسن بنا سوختہ ساماں
ہر ذرہ سے اب وسعتِ صحرا ہے نمایاں — عالم ہے نیا باغ کا یہ منظرِ ویراں

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! اے بادِ خزاں چل!

پھولوں کو بھرا جام شہادت کا پلا دے — ہاں ہستئ گلزار کو تو کیفِ فنا دے
"ہے موت حسیں" راز یہ دنیا کو بتا دے — رنگِ چمنستانِ خزاں دیدہ دکھا دے

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! — اے بادِ خزاں چل!

ہر نکہت و ہر رنگِ گلستاں کو مٹا دے — ہر تفرقہ ہر رنگ کی تمئیز اٹھا دے
گلزار کو ہر قیدِ تعین سے چھڑا دے — اِک جلوۂ بے کیف گلستاں کو بنا دے
تو راہ زنِ ہر سر و سامانِ گلستاں — تو راہبرِ منزلِ عرفانِ گلستاں
از سمتِ عدم سلسلہ جنبانِ گلستاں — جانِ دگر قالبِ بے جانِ گلستاں

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! — اے بادِ خزاں چل!

ہے گلشنِ ویراں میں بھی اک شانِ نزاکت — بے جان چمن میں بھی ہے اک جانِ لطافت
ہاں زنگِ کثافت ہے گل و لالہ کی کثرت — تو آ! کہ گلستاں بنے آئینۂ وحدت

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! — اے بادِ خزاں چل!

ہر ذرے میں افسردہ ہے جو شعلۂ پنہاں — بھڑکے گا وہی بن کے گل و لالہ و ریحاں
اے مرگِ مفاجاتِ چمن جانِ گلستاں — ہیں لاکھوں بہاریں تری شرمندۂ احساں
جلوے ہیں سمائے ہوئے ویران فضا میں — ہیں راز بسائے ہوئے ویران فضا میں
ہر آن نئی ہوتی ہے اک شان فضا میں — اک جان سی پڑ جاتی ہے ہر آن فضا میں

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! — اے بادِ خزاں چل!

آتے ہوئے گلزار کا گلزار لٹا دے — جاتے ہوئے گلزار کا گلزار کھلا دے
ہاں ہستئ گلزار فنا کر کے دکھا دے — گلزار کو صدقے ترے، گلزار بنا دے

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل! — اے بادِ خزاں چل!

فراق گورکھپوری

ایک رومان

تاروں بھری رات خاموش ہے ،
اُس کا حسن ایک کہانی کی طرح دلکش ہے ؛
میرا حق مجھے کیوں نہیں ملتا؟
محبت اور شہرت کی آرزو کیوں بر نہیں آتی؟

جو زمین کے پردے میں چھپ گئے ،
وہ کیوں خوش ہیں ، اور میں کیوں خوش نہیں ؟
رات کی تاریکی مجھ سے کیوں کہتی ہے
کہ موت ایک انعام ہے ، ایک خوشی ؟

ایک پست قد خاکی پوش سپاہی یہ اشعار ایک عجیب لے میں گاتا ہوا ، بارکوں کے بڑے دروازے کی طرف جا رہا تھا ۔ سیرافینو نے مڑ کر تعجب سے اُس کی طرف دیکھا ، کیونکہ وہ بھی اُس وقت خودکشی کے مسئلے پر غور کر رہا تھا ، جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتا تھا ، یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اُن لوگوں کے لئے جو کبھی خودکشی نہیں کر سکتے خودکشی کا خیال جتنا سوہانِ روح ہوتا ہے سیرافینو کے لئے اُسی قدر تسکینِ قلب کا موجب تھا ۔

اُسے خیال آیا " آخر زندہ رہنے سے کیا فائدہ ؟ میری عمر بیس سال کی ہے ، غریب ہوں ، بیمار ہوں ، ناکام ہوں ۔ نہ میرے پاس دماغ ہے نہ ارادہ ہے نہ دولت ہے ۔ میں نے ایک دفعہ ایک افسانہ لکھا تھا ، لیکن جس پرچے کی طرف میں نے اُسے بھیجا اُس کے ایڈیٹر نے ایک لفظ تحریر کئے بغیر اُسے واپس کر دیا ۔ کبھی مجھے اتنی خوشی بھی نصیب نہ ہوئی کہ میرے پاس ایک خوبصورت عمدہ سوٹ ہو ۔ میرے رشتہ دار ایسے غریب ہیں کہ انہیں مجھے نارمل سکول میں پڑھانے کے لئے عظیم الشان قربانیاں کرنی پڑیں ۔ اب میں ایک استاد ہوں ، اور جب میں اپنی فوجی ملازمت ختم کر لونگا تو شاید مجھے ایک "روشن مستقبل" کی امید ہو ۔ اور اس کے بعد موت ! "

" اس کے بعد موت ! " اس نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے ہم کسی جگہ رہتے رہتے تنگ آجائیں اور کہیں اس کے بعد ہم چلے جائیں گے "

اگرچہ سیرافینو حریص تھا نہ مغرور لیکن اس نیک اور شریف بلی کی طرح جسے ظالم بچوں کی بدسلوکی نے جینے سے بیزار کر دیا ہو اُس کے دل میں ایک آخری آرزو تھی ، اور وہ آرزو یہ تھی کہ کاش موت سے پہلے وہ ایک زبردست کشمکش سے اپنی دلیری

کا ثبوت دے سکے، یا کم از کم اپنی ناگہانی موت پر اپنی بلند ہمتی کا اظہار ہی کر سکے۔

مثلاً وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ کسی بڑی دولت مند اور خوبصورت خاتون سے محبت کروں یا کسی فتّان عورت کے عشق میں مبتلا ہو جاؤں۔ وہ بھی ضرور مجھ سے محبت کرے گی، لیکن منزلِ عشق کی بیشمار مشکلات کب اُسے وفا کرنے دیں گی۔ اور اس کی بیوفائی کے بہانے میں خودکشی کر لوں گا۔ اپنی خودکشی کو ایک سانحۂ محبت کا رنگ دینے کے لئے وہ بے وفا عورتوں تک سے محبت کرنے کو تیار تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ ایسی عورتیں آئیں گی کہاں سے؟

غم روز بہ روز اس پر غلبہ پا رہا تھا، کیونکہ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اُس کی آرزوئیں کبھی بر نہیں آئیں گی۔ اُسے معلوم تھا کہ غریبوں کی قسمت میں ہمیشہ فاقوں کی موت ہوتی ہے۔

× × × × × × ×

آج شام اُس پر غم کی ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کے دوران میں موت کا خیال اُس میٹھی نیند کی طرح طویل اور گہرا ہوتا ہے جو ایک کمزور بیمار پر صحت کے بعد طاری ہوتی ہے۔

جہاں وہ اب ایک ہفتے سے مقیم تھا وہ ایک ایسی جگہ تھی جو اُس کے غم کو دم بدم بڑھا رہی تھی۔ یہ ایک پہاڑی جزیرہ تھا جس کی چوٹی پر ایک زنداں کی سفید عمارت دنیا کے اس خوبصورت ترین سمندر کی صاف شفاف وسعت پر اُسی طرح مسلط تھی جس طرح سیرافینو کی جوانی پر موت کا خیال چھایا ہوا تھا۔ اس پر خزاں کی خاموشی اور تنہا شام ہر چیز کو اُداس بنا رہی تھی، یہاں تک کہ خود سمندر نیلا اور سنہری سمندر سردی سے کانپ کانپ جاتا تھا۔

ہوا ساحل کی کائی اور کیکروں میں سے اس تیزی کے ساتھ گذرتی تھی کہ اُن کی سرسراہٹ کا شور بارکوں کے صحن تک سنائی دیتا تھا، اور اس آہِ مسلسل کو سُن سُن کر دل بیٹھا جاتا تھا۔ دیہاتی مکانوں کی طرح نیچی نیچی چھتوں والی بارکوں کے سامنے میدان میں بہت سے سپاہی جمع تھے، اور سب کے سب بادِ خزاں کے طویل اور غم انگیز راگ سے کم و بیش متاثر معلوم ہوتے تھے۔

اُس روز صبح کے وقت تمام قیدی اچھے بھلے تھے، لیکن شام کو یہ سننے میں آیا تھا کہ ایک قیدی سکرات کی حالت میں ہے۔ سیرافینو نے اپنے گانے والے رفیق کے ساتھ ایک بحث شروع کر دی۔ وہ دونوں اکثر ایسی بحثیں کیا کرتے تھے۔ سیرافینو نے کہا "جو لوگ طویل عرصے کے لئے قید ہو جاتے ہیں یا کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ کیوں یہ نہیں سمجھ لیتے کہ اُنہیں خودکشی کر لینی چاہیئے۔"

اس کے موسیقی پرست دوست نے جواب دیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو یہ امید رہتی ہے کہ کبھی نہ کبھی قید ختم ہو جائے گی اور کبھی نہ کبھی مرض جاتا رہے گا۔" اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ اُس نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا "تم کیا کہتے ہو؟ زندگی ایک نہایت خوشگوار چیز ہے! زندہ رہنا ہی ایک فتح الفتوح ہے! اور تم نے یہ بھی کبھی سوچا ہے کہ جتنا زیادہ کوئی بیمار ہوتا ہے یا جتنی زیادہ کسی کو مصیبت پڑتی ہے۔ اتنا ہی زیادہ وہ زندگی سے محبت کرنے لگتا ہے۔"

سیبرافینو نے شاعرانہ انداز سے کہا "یہ محض کہنے کی باتیں ہیں، صحت، آزادی اور دولت کے بغیر زندگی ایک ناکام فتح ہے۔"

اُس کے دوست نے کہا "مجھی کو دیکھو: بیمار ہیں ہوں، دولت میرے پاس نہیں، فوجی ملازمت کرنے پر میں مجبور ہوں لیکن پھر بھی خوش ہوں۔ مگر جو خوش نہیں ہوتے اُن کا حال مجھ سے بھی ابتر ہوتا ہے۔"

"تم نہایت بے حس واقع ہوئے ہو!"

جس طرح کوئی مرغ بے ہنگام بولے ایک کرخت آواز نے اُن کی بحث کو منقطع کر دیا:

"خاموش!"

"حاضر!"

سپاہیوں کی حاضری بولی جا رہی تھی۔

شام کا اندھیرا جلد جلد چھانے لگا۔ مغرب کی طرف آسمان پر ایک پُرشکوہ تیرگی غلبہ پانے لگی، اور کانپتے ہوئے کیکروں میں سے نیلا سمندر خود اپنی روشنی سے چمکتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

بارکوں کے بڑے دروازے کے ساتھ ہی ایک پکّی اور دونوں طرف دو دیواروں سے گھری ہوئی ڈھلوان سڑک شروع ہوتی تھی جس کے آخری سرے پر ایک اور دروازہ تھا۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا اور اس میں سے ایک سرائے کا اندرونی حصہ نظر آرہا تھا۔ سرائے کے اندر ایک دھیمی سی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ ہوا کچھ دیر کے لئے تھم گئی تھی، اور افسر کے حاضری بلانے پر سپاہیوں کے جواب فضا میں پہلے سے زیادہ گونجنے لگے تھے۔ کسی کی آواز میں تازگی اور خوشی تھی اور کسی کی آواز میں غم اور پژمردگی۔ سیبرافینو کے موسیقی پرست دوست کے "حاضر" کہنے میں کسی راگ کے سَم کی سی کیفیت تھی، اور جب سیبرافینو بولا تو اُس کی آواز اتنے فاصلے سے آتی ہوئی معلوم ہوتی گویا ہوا اسے کاہی وزیتون کی آہوں کے ساتھ اڑا کر کہیں دور لے گئی تھی۔

حاضری ختم ہونے کے بعد سپاہیوں نے پھر گانا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ اُن کے کرخت اور وحشیانہ راگ میں ایک تلخی سی ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس دنیائے تعزیر میں پا کر گھبرا گئے ہیں اور اب چلّا چلّا کر اپنے غم کو بھلانا چاہتے ہیں۔ جو سپاہی سب سے زیادہ بلند آواز سے گا رہے تھے اُنہیں رات کے وقت جزیرے کے ساحل پر پہرہ دینا تھا۔ صرف ایک خاموش تھا۔ یہ سیبرافینو تھا۔

× × × × × ×

آدھی رات کے قریب اُس نے اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر پہرہ دیتے ہوئے پایا جہاں دیواروں سے محصور سڑک ختم ہو کر ایک عظیم گھاٹی شروع ہوتی تھی جو سیدھی سمندر میں اُتر گئی تھی۔

اگرچہ ہوا کی تیزی اب زائل ہو چکی تھی لیکن تاروں بھری رات میں اُس کی خنکی کے ساتھ سمندر کی خوشبو مل کر بہار کی سہانی راتوں کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ یکایک اُس لالٹین سے جو ایک کینہ توز آنکھ کی طرح قیدیوں کے اس جزیرے کی محافظت کیا کرتی تھی سبز روشنی کی ایک تیز شعاع نکل کر تاریک سمندر پر پڑی۔

گھاٹی کے نیچے سمندر میں سیرافینو کی آنکھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کی کشتی جو گیس کی تیز شعاع سے روشن تھی، جزیرے کی طرف آرہی تھی، اور اُس میں اُن ماہی گیروں کی وضع کا ایک آدمی بیٹھا تھا جنہیں جزیرے تک آنے کی خاص طور پر اجازت حاصل تھی۔ اُس کا دُبلا پتلا جسم ایک سرخ چادر میں لپٹا ہوُا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جادو کے آتشیں حلقے میں کوئی شیطان چھپا ہوُا ہو۔

تاریک ساحل پر دور بہت دور کہیں کہیں کوئی روشنی نظر آتی تھی یا تاریک آسمان پر ستارے روشن تھے، اس کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

سیرافینو ٹالسٹائی کی تعلیمات سے متاثر تھا۔ اسی لئے جب کبھی وہ پہرے پر کھڑا ہوتا تھا وہ بڑی سختی سے اپنے دل سے یہ سوال کیا کرتا تھا کہ آخر وہ کونسی ہستی ہے جو اُسے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے، اُسے کیوں ایک مجہول و عظیم و مہیب طاقت کی فرمانبرداری کرنی پڑتی ہے ۔ اُس طاقت کی جس کے نمائندے خود اُس سے کم حیثیت ہیں، کوئی کسان ہے تو کوئی نائی، مگر یہاں اُس کے افسر بنے بیٹھے ہیں، کون اُس کی آنکھوں کو متجسس لالٹین کی بے شعور اور کینہ توز آنکھ کی طرح اُس چٹان کی پاسبانی کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کے ساتھ سمندر کی لہریں ہر وقت بے فائدہ سر ٹکراتی رہتی ہیں۔

وہ تنہا نعمت جو قسمت اُسے نہایت آسانی سے عطا کرسکتی ہے نیند ہے۔ پھر کیوں وہ اُن زندہ آدمیوں کے مقبرے کی پاسبانی کی خاطر جنہوں نے کبھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا نیند سے محروم رہے؟ یہ کسے معلوم ہے؛ شاید اُسی مہیب و عظیم اور مجہول طاقت کو معلوم ہو جس کے ہاتھوں وہ ایک بے محبت اور بے درد زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا ـــــ وہ زندگی جس کے دن سمندر کی لہروں کی طرح نیستی کی چٹان کے ساتھ بے مصرف سر ٹکراتے رہتے تھے۔

ماہی گیر اپنی کشتی کو پہاڑی کے دوسری طرف لے گیا، اور روشنی کی شعاع بھی غائب ہوگئی۔ تاریکی پھر پہلے کی طرح چھا گئی سیرافینو کو نیند آرہی تھی۔ جس طرح دریا کی موجیں ایک یکساں، ہموار اور خواب آور سا نغمہ پیدا کیا کرتی ہیں اسی طرح اُس کے غم انگیز خیالات کا راگ اُسے لوری دے دے کر سلا رہا تھا۔ اُس نے خودکشی والے اشعار کو اپنے دل میں ایک دفعہ پھر دہرایا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے انہیں اسی کے لئے لکھا ہے۔ اِن اشعار میں ایک ایسی شیرینی اور کیف تھا جس نے اُس کے دل میں عہد گذشتہ کی یاد تازہ کردی، اور زمانۂ طالب علمی کے اولیں تصورات اُس کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑے کئے۔

رات اب خاموش تھی اور تاروں سے بھری ہوئی، لیکن مسرت انگیز خیالات سے خالی تھی۔ صرف ایک خیال اس تاروں بھری رات کے سکوت کو توڑتا تھا، اور وہ موت کا خیال تھا۔ وہی ایک منتظر دوست تھی جسے وہ اکثر اپنے قریب محسوس کیا کرتا تھا اور آج رات بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی نرم و ملائم وجود فضا میں سے گزر رہا ہے۔ یہ کوئی ہوا کا جھونکا نہ تھا، نہ خوشبو تھی، نہ کوئی نغمہ تھا، بلکہ اِن سب سے زیادہ کیف آور، زیادہ شیریں کوئی چیز تھی، شاید موت جو گزرتے گزرتے اپنے مخملیں فرغل سے اُس کے جسم کو چھو رہی تھی، اپنے نرم ہاتھوں سے اُسے پیار کر رہی تھی۔

اُس نے اپنے دل میں کہا "ضرور اس وقت وہ قیدی مر رہا ہوگا۔ مجھے یاد ہے جب اماں مری تھیں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی غیر مرئی ہاتھ، سمور کی طرح نرم ہاتھ میرے منہ پہ پیار سے پھر رہا ہے۔

گھاٹی کے کنارے پر سے وہ آہستہ آہستہ گلی کی طرف چلنے لگا۔ نیند نے اپنا دامن اور پھیلا دیا۔ ایک لمحے کے بعد اُس سے حرکت کرنی بھی مشکل ہوگئی۔ تھک کر وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ بندوق کو اس نے اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا، اور اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ایک غیر مرئی ہاتھ نے اُس کی آنکھوں کو بند کر دیا ہے۔

اُسی آنکھیں بند تھیں لیکن جیسے کوئی ایک جادو کے نقاب میں سے دیکھے اُس کی آنکھوں نے ایک لمحے کے لئے صاف طور پر دیکھا کہ سمندر اُس کے سامنے ہے، ساحل کی سیاہ لکیر کے ساتھ ساتھ پیلی پیلی روشنیاں جھلک رہی ہیں، ستارے چمک رہے ہیں، شاید کسی روشنی کے مینار میں سے ایک شعاع نکل رہی ہے اور مغموم لہریں اُس کے پاؤں سے آ آ کر ٹکرا رہی ہیں۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ جزیرہ ایک ساز ہے جس کے تاروں پر سمندر کی موجیں ایک بے حد غم انگیز راگ گا رہی ہیں۔ نیند ۔ ۔ ۔ ۔ نیند ۔ ۔ ۔ ۔ آہ اُس نے آج تک نیند کا عذاب اس درجہ محسوس نہ کیا تھا۔ اُسے بار بار یوں معلوم ہوتا کہ کوئی دبے پاؤں اُس کے قریب سے گزر رہا ہے، بار بار اُسے اُس قیدی کا خیال آتا تھا جس کے متعلق سنا گیا تھا کہ وہ سکرات کی حالت میں ہے۔ شاید اب تک مر چکا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ آخر اُس نے نیند پر غلبہ پالیا! ان خیالات میں نیند کیسے ٹھہر سکتی ہے؟ وہ قیدی کو جانتا تھا۔ اُس نے سڑک کی مرمت کا کام کرتے ہوئے اکثر اُسے دیکھا تھا۔ بلند و بالا پتلا دبلا اور بڑھاپے سے ذرا جھکا ہوا قد، شگفتہ اور خوبصورت چہرہ اور دو نیلی سی ہنستی ہوئی آنکھیں۔

× × × × × × ×

لیکن ـــ لیکن ـــ اب تو اُن پر اسرار قدموں کی چاپ حقیقت میں سنائی دینے لگی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے آپ کو ایک جھٹکا دے کر اچھی طرح بیدار کر لیا۔ چھپ کر نکل جانے والے قیدیوں کی کہانیاں اُس کے ذہن میں چکر لگانے لگیں۔ آج سے چند ماہ پیشتر ایک ایسے ہی ماہی گیر کی کشتی سے فائدہ اُٹھا کر پانچ قیدی بھاگنے میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہو گئے تھے، اور تعجب تو یہ ہے کہ ان میں ایک ستر سال کا بڈھا بھی تھا۔ جب وہ مقابل کے ساحل پر پہنچے تو انہیں کچھ سمجھ نہ آئی کہ کہاں چھپیں اور اس لئے وہ آٹھ دن تک انہیں پہاڑیوں میں گھومتے رہے جو کچھ زیادہ غیر آباد نہیں ہیں۔ آخر ہمارے سپاہیوں نے انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا اور سخت سردی کے موسم میں اُنہیں کپڑوں سے بھی محروم کر دیا گیا۔

× × × × × ×

کیا یہ وہم تھا؟ کیا یہ حقیقت تھی؟ کوئی دبے پاؤں جا رہا تھا! بلا شبہ دیوار کے پیچھے ڈھلوان سڑک پر سے کوئی آدمی نیچے اُتر رہا تھا۔ اب اس میں کچھ شک نہ تھا۔

"کون ہے؟"

اُس کی آواز نہایت صفائی اور تحکم کے ساتھ فضا میں گونجی۔ اس کے بعد پھر پہلے کی طرح خاموشی چھا گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید پھر اُسے دھوکا ہوا ہے۔ اُسی وقت دیوار سے ایک شخص نے چھلانگ لگائی اور تیزی کے ساتھ سڑک پر سے

اُترنا شروع کر دیا۔

"کون ہے؟"

اگرچہ سیرافینو ہر بات کے لئے تیار تھا لیکن پھر بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

"ہش!" اُس شخص نے دلیرانہ اُس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

رات کی تاریکی میں وہ شخص مدافعانہ یا شاید ملتجیانہ انداز میں اپنے ہاتھ پھیلائے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ صرف اُس وقت اُس نے اپنی پیش قدمی کو روکا جب سپاہی کی بندوق اُس کے ہاتھ کو چھونے لگی۔ سیرافینو کا خوف حیرت سے تبدیل ہو گیا۔ اُس نے جانباز قیدی کو پہچان لیا تھا۔

"کھڑے رہو ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا!"

قیدی نے اپنا سر جھکا دیا اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ اب بھی اُسی طرح ملتجیانہ انداز میں آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے یا شاید فطری طور پر وہ مدافعت کر رہا تھا۔

سیرافینو نے چلا کر کہا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

قیدی نے نہایت نیچی مگر مضبوط آواز سے کہا "اس طرح بلند آواز سے نہ بولو۔ لو میرے ہاتھوں کو باندھ لو مگر دوسروں کو خبر نہ ہونے دو۔ تم ایک مسیحی ہو اور مسیح کا فرمان ہے کہ کسی کو جان سے نہ مارو۔ میں بڈھا ہوں، تم مجھے آسانی سے گرفتار کر سکتے ہو۔"

سیرافینو نے پھر نہایت سختی سے چلا کر کہا "خاموش! بتاؤ تم کہاں جا رہے تھے؟"

بڈھے نے ہاتھوں کو نیچے گراتے ہوئے سادگی سے کہا "میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔" پھر سپاہی کی سختی کے باوجود غالباً اس خیال سے کہ وہ مسیحی ہے اُس نے ان الفاظ کا اضافہ کیا "مجھے گزر جانے دو۔ کسی کو خبر بھی نہ ہو گی کہ میں یہاں سے گزرا ہوں۔"

"خاموش رہو ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔ اب میں جگوُنی بجانے لگا ہوں۔"

یکایک قیدی نے ایک اضطرابی جنبش کی۔ وہ اور جھک گیا اور ایک کتے کی طرح سپاہی کی ٹانگوں میں پناہ لینے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دوسروں سے ڈر کر جو اب کوئی دم میں ظاہر ہوا چاہتے تھے اُس کی حمایت میں آنا چاہتا ہے۔

"نہیں، نہیں، میرے بیٹے، نہیں۔ اوروں کو مت بلاؤ۔" چونکہ سیرافینو اُس کی بات کو سن رہا تھا اس لئے اُس نے جرأت کر کے اپنا سر ذرا اُٹھایا اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر کہنے لگا "مجھے باندھ لو، باندھ لو مگر دوسروں کو نہ بلاؤ! میں نے بھاگنے کے لئے بیماری کا بہانہ کیا تھا۔ ایک عورت ایک بڑھیا بیس سال سے میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔ اب اُس نے لکھا ہے کہ وہ بیمار ہے، بہت بیمار، لیکن اگر وہ مجھے ایک دفعہ دیکھ سکے تو وہ خوشی سے جان دے دے گی۔ میں نے اُسے لکھا ہے کہ میں اُسے خوش کرنے کے لئے، اُسے عمر بھر کا رنج دینے کے بعد یہ آخری راحت پہنچانے کے لئے سب کچھ کر گزروں گا۔ اب وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اگر میرا وعدہ پورا نہ ہوا تو اُس کی موت عجب مایوسی کی موت ہو گی۔ آہ اگر تم نے مجھ پر رحم نہ کیا تو میں کیا کروں گا؟ بیٹے رحم کرو! میرے

لئے نہیں تو اُس بوڑھی مرنے والی ہی کی خاطر رحم کرو جس نے تمام عمر مصیبت میں کاٹ دی ۔ اگر میری جگہ تمہارا بوڑھا باپ ہوتا اور تمہاری جگہ میرا سپاہی بیٹا تو بتاؤ تم کیا کہتے ؟ مجھے گزر جانے دو ۔ دنیا میں ہم سب بھائی بھائی ہیں ۔ کون جانتا ہے کہ کسی دن شاید میں بھی تمہارے کام آسکوں ۔ یہاں سے ــــ " سیرافینو کی خاموشی سے حوصلہ پاکر وہ مڑا اور اشارہ کر کے کہنے لگا " یہاں سے میں نیچے اتر جاؤنگا ۔ چٹان پر میرے پاؤں کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا ۔ گویا تم نے کچھ نہیں دیکھا اور ــــ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا " ۔

سیرافینو کو ایسا معلوم ہؤا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے ۔ وہ اُس کے بھاگنے کا اعلان کرنا چاہتا تھا ، اُسے باندھ لینا چاہتا تھا ، یعنی وہ کچھ کرنا چاہتا تھا ، جسے اُس کے افسر " فرض " کہا کرتے تھے ۔ لیکن کچھ نہ کرسکتا تھا ۔ ایک پراسرار طاقت جس سے انسان کا صرف خواب میں سابقہ پڑتا ہے اُسے کوئی حرکت نہ کرنے دیتی تھی ۔ مجرم کا پھولا ہؤا سانس اور ستم رحمانہ انداز دیکھ کر اُس کا دل پگھل گیا ، بلکہ اس بڈھی جان کے لئے جس کا رابطہ اس قعر مصیبت میں پڑکر بھی زندگی کیساتھ استوار تھا اُس کے دل میں اُس کیلئے تعریف کا جذبہ پیدا ہوگیا ۔

اپنے دل سے یہ سوال کئے بغیر کہ آیا اُس کی اپنی جان زیادہ قیمتی ہے یا اِس بدقسمت قیدی کی اُس نے خیال کیا کہ اب اس کے لئے خودکشی کا بہترین موقع ہے ۔ لوگ سمجھیں گے کہ اس نے اپنے فرض کی بجا آوری میں اپنی جان تک دے دی ۔ ہاں وہ اس موقع کو کبھی ضائع نہیں کرے گا ۔

اُس نے آہستہ سے کہا " جاؤ ، چلے جاؤ " اور اپنی بندوق اُٹھا کر زمین پر رکھدی ۔ قیدی خاموشی کے ساتھ اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا ، پھر ایک ہاتھ سے زمین کا سہارا لیتے ہوئے وہ مشکل سے اُٹھا اور کھڑا ہوگیا ۔ اُس کا بلند قد رات کی طرح تاریک نظر آرہا تھا ۔ نہایت ہلکی آواز میں اُس نے کہا " میرے بیٹے ، تمہیں بڑی دولت نصیب ہوگی اور بڑی خوشی ــ تمہیں اتنی ہی دولت ملے گی جتنی تم نے نیکی کی ہے " ۔

آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سیرافینو نے دیکھا کہ قیدی کا بلند اور تاریک پیکر چٹان کی دیوار کو پھلانگ گیا ۔ اس کے بعد چند چھوٹے چھوٹے پتھروں کے نیچے کی طرف سرکنے کی آواز آئی ، اور پھر سمندر کی لہروں کا وہی سریلا اور مغموم نغمہ رات کی خاموشی کو توڑنے لگا ۔

× × × × × × ×

سیرافینو نے اپنے دل میں کہا " دولت اور خوشی کہاں ، بلکہ اس کے برعکس مجھ سے زیادہ بدنصیب اور ناخوش کون ہوگا " !

زندگی کے اِس آخری لمحے میں بجائے اس کے کوئی سنجیدہ خیال اس کے دل میں آتا گزری ہوئی زندگی کی ادنی ادنی تلخیاں اُسے یاد آنے لگیں ۔ آہ پر تکلف کھانوں کا وہ کبھی خواب تک نہ دیکھ سکا تھا ۔ اُسے اپنے جوتوں کو دیر تک صحیح و سالم رکھنے کے لئے کتنی جدوجہد کرنی پڑتی تھی ، اور ایک سیاہ سوٹ کی اُسے ہمیشہ ہی کتنی آرزو رہی تھی ۔ آہ اسے سرد موسم میں گرم کپڑے حاصل کرنے کے لئے کتنی صعوبت برداشت کرنی پڑتی تھی ۔

اس سے بڑھ کر بھی کوئی مصیبت ہوگی ؟ اُس کی ہر چیز پرانی ، خراب و خستہ اور فرسودہ ہوچکی تھی بلکہ شاید اس کی روح بھی کسی پرانے کپڑے کی طرح فرسودہ و مضمحل تھی ۔ ہر بات کا انجام آپہنچا تھا قسمت کے ساتھ لڑائی ختم ہوچکی تھی ، اُس قسمت کے ساتھ جس کے

دو شکار اُس نے چھین لئے تھے — اپنا آپ اور بوڑھا قیدی۔ اور اسی بوڑھے قیدی کی طرح اب خود بھی دنیا کے قید خانے سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

× × × × × ×

اُس نے بندوق کو زمین پر رکھ دیا اور اُس کا سرد دہانہ اپنے گلے سے لگالیا۔ آخری گھڑی آپہنچی تھی۔ وہ محبت سے محروم اُمید سے محروم، ایمان سے محروم مر رہا تھا، لیکن رحم کا ایک پُر اسرار احساس اُس کے دل میں موجود تھا۔
اُس کی موت پر کوئی نہ روئے گا۔ لیکن وہ تمام مصیبت زدوں کے لئے روتا ہوا مر رہا تھا۔ خدا حافظ! ستاروں کی روشنی اب اُسے نظر نہ آتی تھی، موجوں کا نغمہ اب اُسے سنائی نہ دیتا تھا۔ موت کا سیاہ پردہ ہر چیز کے درمیان حائل ہو رہا تھا۔ خدا حافظ! اُس نے لبلبی پر ہاتھ رکھنا چاہا لیکن یکایک بندوق اُس کے ہاتھ چھوٹ کر دھم سے زمین پر آرہی۔

× × × × × ×

بندوق کے گرنے کی آواز سن کر وہ کانپ گیا اور جاگ اٹھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے اور سمندر کی موجیں ہلکا ہلکا نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔ بندوق حقیقت میں اُس کے گھٹنوں سے نیچے گر گئی تھی۔ خواب کے اثرات سے وہ اس قدر بے حس ہو گیا تھا کہ چند لمحوں کے لئے وہ بالکل حرکت نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ اُس نے بندوق بھی زمین سے نہ اُٹھائی۔

× × × × × ×

دوسرے دن اُس نے سنا کہ عین اُس وقت جب اُسے خواب آ رہا تھا وہی بوڑھا قیدی ایک ایسے راستے سے جہاں اُس کو روکنے کے لئے کوئی پاسبان موجود نہ تھا حقیقت میں بچ نکلا تھا۔ لیکن آگے جا کر کسی سپاہی نے اُسے مار دیا تھا۔

× × × × × ×

شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ کائی اور کیکر کے درختوں میں سے سائیں سائیں کی آواز آرہی تھی، اور گلابی بادلوں والے آسمان کے نیچے اُن پر تاریکی کی ایک گھٹا چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لال اور نیلے پانی پر سرد ہوا کے جھونکے ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر رہے تھے۔
سپاہی صحن میں جمع ہو کر گا رہے تھے۔ سیرافینو نے بڑے دروازے کے سامنے کھڑا ہونے کی بجائے فراغت کے اِس گھنٹے میں ایک چھوٹا سا ناول لکھنا شروع کر دیا۔ جب وہ لکھ رہا تھا تو اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے آس پاس ہر چیز نے ایک عجیب پر اسرار صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ میز کی سطح پر پانی کا ایک حقیر سا قطرہ بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر رہا تھا اور آفتاب کی آتشیں کرنوں میں ایک ننھی سی چنگاری کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔
وہ کئی دن تک اس افسانے کو لکھتا رہا۔ ایک شام اُس کے موسیقی پرست دوست نے دیکھا کہ سیرافینو صفحے کے اختتام پر اپنا نام ثبت کر رہا ہے۔ اُس نے کہا کیا میں اسے پڑھ سکتا ہوں؟
سیرافینو نے پہلے تو انکار کیا، مگر کسی قدر اصرار کے بعد آخر اُس نے مسودہ اپنے دوست کے حوالے کر دیا۔ افسانہ ایک ڈائری کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ ایک سپاہی کی تحویل میں کچھ قیدی ہیں جن میں سے ایک اُس سڑک کی تعمیر کے کام پر متعین ہے جو سمندر کے ساحل سے قید خانے کی طرف جاتی ہے۔ اس طرح اُسے

سپاہی کو اپنی مصیبت اور دنیا کی بے انصافی کا ایک طویل افسانہ سنانے کا موقع مل جاتا ہے۔ سپاہی اس کی باتیں سن سن کر روز بروز رحم کے جذبے سے مغلوب ہوتا جاتا ہے۔ قیدی اس سے کہتا ہے کہ مجھے یہاں سے بھاگ جانے میں مدد دو۔ سپاہی کو اگرچہ ادائے فرض کا بہت زیادہ احساس ہے لیکن پھر بھی اس کی ترغیب میں آجاتا ہے، اور ایک رات جب کہ وہ پہرے پر ہوتا ہے وہ قیدی کو بھاگتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے۔ اس کے بعد سپاہی خودکشی کر لیتا ہے۔

اُس کے دوست کو افسانہ اتنا موثر اور رقت انگیز معلوم ہوا کہ اس نے کہا "بالکل ایک وہی ناول معلوم ہوتا ہے"۔

سیرافینو نے ذرا طیش آمیز لہجے میں پوچھا "مگر یہ کیوں نہیں معلوم ہوتا؟ تم یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ یہ واقعہ مجھ پر گزرا ہے"؟

"اس لئے کہ تم ابھی زندہ ہو!"

"مگر پھر بھی یہ مجھی پر گزرا ہے —— خواب میں!"

"خواب میں"؟

"ہاں خواب میں، یا ہماری زندگی کے اُس حصے میں جسے ہم خواب کہتے ہیں، اور جسے اگر ایک دوسری نظر سے دیکھا جائے تو شاید وہی حقیقت ہو۔ کیونکہ یہ تو ہمیں علم ہی نہیں حقیقت ہے کیا چیز"۔

سیرافینو نے طنزیہ انداز میں کہا "حقیقت تو یہ ہے کہ تمہاری باتیں سن سن کر میں اپنی بیداری کو خواب سمجھنے لگا ہوں"۔

اس کے بعد حسب معمول ایک طویل بحث کا سلسلہ چھڑ گیا۔ آخر اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ اس افسانے کو میلان کے ایک رسالے میں بھیج دیا جائے۔ ایک عرصے تک وہ انتظار کرتے رہے لیکن رسالے کے دفتر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

× × × × × × ×

سیرافینو کا مکان دو کمروں پر مشتمل تھا جن پر ایک عارضی چھت ڈالی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیواریں تعمیر ہوتے ہی اس کی تعمیر روک دی گئی تھی اور اب تک کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہنے سے یہ بالکل ویرانہ بن گیا تھا۔ پتھر کا ایک زینہ جو مکڑیوں اور چھپکلیوں کا گھر بنا ہوا تھا اوپر جاتا تھا، اور بعض اوقات سیرافینو بھی اُنہیں حشرات الارض کی طرح کوٹھے پر چڑھتا تھا اور ادھر اُدھر گھومتا تھا۔ کھڑکیوں کے موکھوں میں کھڑے ہو کر وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا زندگی اُس کے لئے بھی اسی بے چھت اور بے در مکان کی طرح نہیں ہے جس کی دیواریں بغیر کسی مصرف کے کہنہ و فرسودہ ہو گئی ہیں؛

مکان کے پیچھے پہاڑی جنگل تھا اور بہار کی راتوں میں جنگلی پھولوں کی خوشبو اُس کے کمروں کو مہکا دیا کرتی تھی۔ ایک چھوٹا سا غیر آباد باغیچہ اس کے مکان اور سکول کے درمیان حائل تھا۔ لیکن خزاں کے دنوں میں جنگل کے اس گوشے سے زیادہ ویران اور زیادہ اداس اور کوئی جگہ نہ ہوتی تھی۔

خزاں کے ایک دن کا ذکر ہے: فضا بے نور اور مرطوب تھی، ہر چیز پر دھند اور اداسی چھائی ہوئی تھی —— لیکن ایسے دنوں میں ایک خصوصیت ضرور ہوتی ہے کہ اُن کو ہمارے جذبات کے ساتھ ایک پراسرار ہمدردی کا علاقہ معلوم ہوتا ہے، اور جنگل کلاً

کی ایک ہلکی ہلکی خوشبو تک ان دنوں میں ایامِ گزشتہ کی یاد کو تازہ کر دیا کرتی ہے۔ ایسے ہی ایک دن کا ذکر ہے کہ سیرافینو کو ایک خط موصول ہوا جس پر ولندیزی ڈاک خانے کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک اس نیلے لفافے کی طرف دیکھتا رہا جس پر گول گول حروف میں اس کا نام لکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کب اور کہاں اُس نے اس دستخط کو پہلے دیکھا ہے۔ مگر وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ بچپن کے زمانے میں جب اُس نے پہلی دفعہ ایک کہانی لکھی تھی تو اُسے ایک مشہور مصنف بننے کی اُمید تھی اور دور دراز کے ملکوں سے ہر روز اسی قسم کے خطوط موصول ہونے کی توقع تھی۔ اُس نے بیتاب ہو کر ایک ہی جھٹکے میں لفافے کو کھول دیا۔

× × × × × ×

جنابِ من،

میلان ریویو میں آپ کا دلکش اور لطیف افسانہ "رحم" میں نے پڑھا ہے، اور میں چاہتی ہوں کہ اگر آپ کسی اور کو اس کے ترجمے کی اجازت نہیں دے چکے تو میں اس کا ترجمہ جرمن اور ولندیزی زبان میں کر دوں۔ جرمن ترجمے کے متعلق مجھے تقریباً یقین ہے کہ رسالہ "افکار" میں چھپ جائے گا۔ جو اس وقت دنیا کا سب سے موقر اور مشہور پرچہ ہے۔ میں جرمن ہوں، لیکن میری ماں کے والدین ولندیزی تھے، اور مجھے یہ زبان بھی پوری طرح آتی ہے، کیونکہ میں زیادہ تر ہالینڈ ہی میں رہتی ہوں۔ میں بہت دفعہ اٹلی گئی ہوئی ہوں، اور فلورنس میں حسنِ اتفاق سے مجھے پروفیسر گوٹینی کے گھر میں رہنے کا موقع ملا ہے، اس لئے مجھے طالوی زبان سے کافی واقفیت ہے اور آپ کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ میں صحیح ترجمہ کروں گی۔ نیپلز کی چند روزہ اقامت کے دوران میں میں نے نسیدا کا جزیرہ بھی دیکھا ہے جس کے باعث مجھے آپ کے افسانہ سے دوگونہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ترجمے کی اشاعت کی شرائط آسانی سے طے ہو سکتی ہیں کیونکہ میں "افکار" کے ایڈیٹر کو لکھ دوں گی کہ وہ تمام معاوضہ براہِ راست آپ کی طرف بھیج دیں۔

اس کے علاوہ مجھے مسرت ہو گی اگر آپ مطلع فرمائیں کہ آپ نے اور کون کون سے ناول لکھے ہیں" اور میں ممنون ہوں گی اگر آپ اپنی زندگی کے کچھ حالات مجھے بھیجیں گے کیونکہ میں انہیں ترجمے کے ساتھ شامل کرنا چاہتی ہوں۔

اُمید ہے کہ آپ جوابِ باصواب سے جلد سرفراز فرمائیں گے اور میرا دلی شکریہ قبول فرمائیں گے۔

الزبتھ کرکر

× × × × × ×

سیرافینو نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ خوش حالی اور دولت امن و مسرت کا پیغام لے کر آئے گی، لیکن یہ کیا بات تھی کہ الزبتھ کرکر کے خط سے اُس پر ایک خوف کا سا احساس طاری ہو رہا تھا؟ بلکہ پہلے پہل تو وہ اپنے آپ میں اسے دوسری مرتبہ پڑھنے کی جرأت بھی نہ پاتا تھا۔ کیا یہ کوئی خواب تھا؟ اُس نے بیداری کا یقین کرنے کے لئے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی پھر ایک سوئی لے کر اپنے ہاتھ میں چبھو لی۔ آخر اُس نے خط کو ایک دفعہ اور پڑھا اور پھر اس طرح چھپا لیا جیسے وہ خائف تھا کہ کوئی اُسے چرا نہ لے۔

اپنی کامیابی کا پہلا احساس اُسے اس صورت میں ہوا کہ اُسے یقین ہونے لگا کہ لوگ اُس کی مسرت کو زہر آلود کرنے کی کوشش

کریں گے۔ لیکن اس کے برعکس اُس نے دیکھا کہ پہلے کی بہ نسبت اب اُس سے زیادہ نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ اور اُس کے دل میں بھی حاسدوں کے لئے، اُن کے لئے جو اس واسطے حسد کرتے ہیں کہ وہ ناخوش ہیں رحم و رافت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد اُسے خوشی محسوس ہونے لگی ــــ اتنی خوشی کہ اُسے ڈر آنے لگا۔

اُس نے کھڑکیاں کھول دیں اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ ہر چیز پر دھندلا اور اسی دُرِ سکوت چھایا ہوا تھا، لیکن اس کے لئے ایک روشن افق کا ظہور عمل میں آچکا تھا۔

× × × × × ×

محترم خاتون،

مجھے آپ کی تجویز شکریے کے ساتھ منظور ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے! میں کوئی مصنف نہیں ہوں، لیکن چونکہ آپ میرے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچانا چاہتی ہیں اس لئے میں یہ سطور لکھنے پر مجبور ہوا ہوں۔ میں ایک معمولی اُستاد ہوں جسے ایک وحشی اور ویران ملک میں جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ میں تنہا ہوں، اس قدر تنہا کہ ایک دوستانہ آواز خواہ وہ کتنی دور سے آئے، مجھ میں نئی روح اور نئی اُمید پھونکنے کو کافی ہوتی ہے۔ آپ کا خط، خاتون صاحبہ، مجھے عجب مایوسی کی حالت میں موصول ہوا۔ اُس وقت موت کے خیال میں اس قدر شیریں تھی کہ مجھے اُس میں آغوشِ مادری کا سا لطف آ رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میرا افسانہ چھپ چکا ہے۔ میں نے اسے اپنی زندگی کی مغموم ترین گھڑیوں میں لکھا تھا اور یہ دلچسپ اس لئے ہے کہ میں نے اسے محسوس کیا تھا۔ اپنے ہیرو کی جگہ اگر میں خود ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو اُس نے کیا۔ میں ایک اور بات بھی آپ کو بتا دوں۔ یہ ساری کہانی میرا خواب ہے۔

اس خواب میں بے حد متاثر ہوا۔ بڑی مدت تک مجھے یقین رہا کہ میں نے قیدی کو التجائیں کرتے ہوئے حقیقت میں دیکھا ہے۔ پھر وہ منظر بھی اب تک میرے سامنے ہے جب اُس نے مجھے بددعا دی تھی۔ اُس دن کے بعد جب کبھی میں ناخوش ہوا ہوں یا مجھے انسانی ہمدردی اور محبت کی آرزو محسوس ہوئی ہے تو اُس قیدی کی پیشین گوئی کے الفاظ قسمت کی طعنہ زنی کی طرح کسی قدر تلخی کے ساتھ میرے حافظے میں تازہ ہو گئے ہیں۔ لیکن آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اپنے ایک بھائی کے لئے میرا جذبۂ رحم رائگاں نہیں گیا۔

انسان پر ہر قسم کا زمانہ آتا ہے اور میرے لئے بھی خوشی کا زمانہ آ گیا ہے۔ آج میری زندگی کی ابتدا ہوئی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک طویل خواب سے بیدار ہوا ہوں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک پُراسرار قوت میرے اندر پیدا ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں تنہا ہوں ساری عمر کے لئے جلاوطن ہو گیا ہوں، لیکن اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میری روح کی آواز دور دور تک پہنچ سکتی ہے اور پہنچ چکی ہے بلکہ ہم جنس روحوں کی طرف سے میرے پیغام کا جواب بھی لا چکی ہے۔ اور میرے دل میں زندگی کی محبت پیدا کرنے میں جتنا اس خیال نے کام کیا ہے میری حقیر تصنیف کی شہرت نے نہیں کیا۔

آپ کی اس عنایت کے لئے جو آپ نے مجھ پر کی ہے میں ایک دفعہ اور شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے ہمیشہ اپنا بندۂ ممنون خیال فرمائیں گی۔

سیرافیتو راسی

جنابِ محترم

آپ کا خط ملا۔ میں آپ کے اعتماد کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ یقیناً آپ ایک شریف الطبع انسان ہیں اور مجھے آپ سے متعارف ہونے کی بے حد خوشی ہے۔ اُمید ہے کہ مجھے یوں ہی آپ کے پُرخلوص خطوط موصول ہوتے رہیں گے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نوجوان ہیں۔ میری عمر اس حد سے کچھ متجاوز ہے، اور اس لیے میں نہ صرف آپ کی مترجم بننا چاہتی ہوں بلکہ آپ کی دور اُفتادہ دوست ہونے کی خواہش بھی رکھتی ہوں۔ دور افتادگی بھی کوئی نہیں، فاصلے کی آج کل حقیقت ہی کیا ہے۔ ابھی اگلے ہی دن میں نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ بہت سی عورتیں سیاحت کے لئے یورپ سے امریکہ جا رہی ہیں۔

آپ کے خط کو میں نے آپ کے افسانے سے بھی زیادہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ یہ کسی رومان کا ایک باب معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ کون ہے جس کی کتابِ زندگی میں رومان کا کم از کم ایک باب، کم و بیش خوبصورت، کم و بیش خوفناک باب موجود نہ ہوتا ہو۔

آپ کے افسانے "رحم" میں حقیقت کی ایک ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جس کا احساس مجھے ایک خاص وجہ سے ہوا۔ ہمارے گھرانے کا ایک قدیم دوست جو مجھے اپنے باپ کی طرح عزیز تھا، چند سال ہوئے اپنی دوسری بیوی کو اُس کی بیوفائی پر قتل کر دینے کے الزام میں ماخوذ ہو گیا تھا۔ اُس نے قید خانے سے بھاگ جانے کی کوشش کی، لیکن ایک پہرے دار نے اُسے مار دیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے افسانے نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اسی لئے بلکہ اس لئے بھی کہ آپ کا اندازِ بیان نہایت سادہ اور بلیغ ہے میں آپ کو مشورہ دینے کی اجازت چاہتی ہوں کہ آپ لکھنے کی مشق جاری رکھیں۔

میں نے چند ناول لکھے ہیں اور اطالوی شاعری اور افسانوں کا کچھ ترجمہ کیا ہے، اس کے علاوہ جن دنوں میں لیبڈ میں مقیم ہوتی ہوں میں تقریباً تیس یتیم بچوں کا ایک سکول چلاتی ہوں۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگیوں میں ایک مشابہت پائی جاتی ہے لیکن مجھے زندگی پر آپ سے زیادہ اعتماد ہے، اور اس لئے مجھے یہ کہنے کی جرأت ہوئی ہے کہ مایوس ہو جانے میں آپ غلطی پر ہیں۔ غربت دراصل بڑی دولت ہے۔ امیر آدمی کی بہ نسبت غریب آدمی کے لئے زندگی کو بے فائدہ کھونے کا کم احتمال ہے، اور ایک حقیقی اخلاقی زندگی بسر کرنے کا زیادہ امکان ہے اور اگر اور کچھ بھی نہ ہو تو اتنا تو ضرور ہے کہ غریب آدمی کی زندگی ــ مادی حیثیت سے بھی ــ اُس کی اپنی ذات کی رہینِ منت ہے۔ ہاں ہاں یقین مانئے غربت ادنیٰ ترین انسانی مصائب میں سے ہے۔

اگر میں اپنے مفہوم کو اچھی طرح ادا نہ کرسکوں تو مجھے معاف فرمائیے گا۔ کاش مجھے اپنے خیالات کو، اُن خیالات کو جو میرے دماغ میں میری پر الم زندگی نے پیدا کر دئے ہیں اچھے پیرائے میں ادا کرنے کے لئے آپ کی سی خوبصورت زبان لکھنے کا راز معلوم ہوتا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہماری دوستی قائم رہے گی اور اس طرح ہمیں ایک دوسرے کو بہتر طریق پر جاننے کے موقعے ملتے رہیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سیرافینو کا خیال تھا کہ خط کے بقیہ حصے میں کچھ ایسی باتیں لکھی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ الزبتھ کر کر بہت زیادہ خلوص والی عورت نہیں ہے۔ مگر اُس نے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ شاید مشق کے خیال سے یا شاید طوعاً و کرہاً وہ اپنے گھر والے

بلیغچے، اپنی پہاڑی، اپنے سکول، اپنے شاگردوں کی لفظی تصویریں بنا بنا کر الزبتھ کو بھیجتا رہا اور اس طرح اُس نے اپنی اداس زندگی کا پورا پورا نقشا کھینچ کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

× × × × × ×

اسی طرح ایک سال اور چھ مہینے گزر گئے۔ دو دفعہ سرد اور مرطوب خزاں آئی ایک دفعہ پھولوں بھری بہار، ایک دفعہ تپتی ہوئی گرمی اور دو دفعہ بہار جیسا خوشگوار اور نکھرا ہوا جاڑا۔

سیرافینو کو اُن موسموں کے سرد و گرم کی کوئی بات یاد نہ رہی جن کو اُس نے گویا آنکھیں بند کر کے گزارا تھا، لیکن موجودہ موسمِ بہار کی گرمی اور گزشتہ دو جاڑوں کا لطف اُسے کبھی بھول نہ سکا۔

اُس کی مصنفیت نے اُس کے ساتھ دشمنی کی۔ سارا علاقہ اب اُس کی صرف اس وجہ سے عزت کرتا تھا کہ "افکار" کے کارپردازوں نے اُس کی طرف رسالے کی دس کاپیاں اور ستر فلورن۔ ایک رجسٹرڈ خط میں ملفوف کر کے بھیجے تھے۔ سیرافینو ہرگز یہ نہ چاہتا تھا کہ اُس کی شہرت وہاں بھی پہنچ جائے جہاں وہ ایک معمولی استاد کی حیثیت سے بچوں کو پڑھاتا تھا، لیکن اس کی عظمت اور دولت کا راز ڈاک خانے والوں نے افشا کر دیا۔

× × × × × ×

موسمِ سرما کی سرد مہری کا اب اُسے کوئی شکوہ نہ تھا۔ اُس کے آس پاس ہر چیز حسین اور دلکش تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اُس سے محبت کرتا ہے اور اُسے بھی کسی سے محبت ہے! یہ سچ تھا کہ الزبتھ نے کبھی اُس کی طرف یہ نہ لکھا کہ اُسے اُس سے محبت ہے نہ خود اُس نے اُس کی طرف یہ لکھا تھا، لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی ۔۔۔ وہ صرف سمجھ لی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ سیرافینو اُسی قسم کی محبت کر رہا تھا جیسی وہ ایک زمانے میں کرنی چاہتا تھا، بغیر سوچے سمجھے، بغیر کسی توقع کے، صرف محبت کرنے کی خاطر۔ الزبتھ بڑی امیر تھی، اور مغرور بھی تھی، لیکن اس علاقے کی لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی بلکہ ایک دن اس نے سیرافینو کو لکھا تھا:

"میں خوش ہوں کہ میرے اور اُس شخص کے درمیان جو کسی دن مجھ سے اظہارِ محبت کرنے والا ہے ایک بڑی مشکل حائل ہے۔ یہ مشکل اُن اخلاقی مشکلات میں سے ہے جن پر ہر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا.........."

سیرافینو نے یہ نہ پوچھا کہ اس مشکل کی نوعیت کیا ہے۔ کیا الزبتھ کی گذشتہ زندگی پر یہ کوئی داغ تھا۔ سیرافینو کو اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کبھی الزبتھ تک نہ پہنچ سکے گا نہ اُس کی محبت کی جستجو کرے گا۔ لیکن چونکہ اب اُس کا خوابِ محبت ایک حقیقی شکل اختیار کر چکا تھا اس لئے موت کا خیال اُس کے دل میں باقی نہ رہا تھا۔

× × × × × × ×

اتنے میں بہار کا دوسرا موسم بھی آن پہنچا۔ سیرافینو کے تنہا مکان کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں چھوٹے چھوٹے پیلے پیلے پھولوں سے

بھر گئیں اور پہاڑ سے بھی جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔

بہار کی چھٹیوں میں سیرافینو نیپلز چلا گیا۔ اُس سے ایک دن پہلے الزبتھ بھی وہاں پہنچ چکی تھی اور ہوٹل میں اس کی منتظر تھی۔

سیرافینو کی طبیعت میں کامل سکون تھا اور اُس نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ دولت مند الزبتھ سے ملتے وقت وہ اپنی غریبانہ تمکنت کو ہاتھ سے نہ جانے دیگا۔ لیکن جونہی کہ وہ ریلوے چوک کے قریب پہنچا اپنے تمام ارادوں کے باوجود اس کے دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔

چوک میں بڑی رونق تھی اور لوگوں کے رنگ برنگ لباسوں نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی اور آسمان پر جا بجا سفید براق اور روشن بادلوں کے ٹکڑے نہایت تیزی سے رواں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جلد سے جلد کسی انجمن میں پہنچنا چاہتے ہیں۔

× × × × × × ×

اس کے دو گھنٹے بعد سیرافینو اور الزبتھ کر کر دونوں سگینولی کے ساحل پر کھڑے تھے۔ نسیڈا کا جزیرہ اُن کی نظروں کے سامنے تھا۔

الزبتھ اطالوی عورتوں ہی کی طرح خوبصورت تھی۔ سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں، چاند سا چہرہ، گلابی ہونٹ اور موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت۔ جو بات سیرافینو کو پسند نہ آئی وہ اُس کے ہونٹوں کا وہ خم تھا جو کوئی مشکل اطالوی لفظ بولتے وقت پیدا ہو جاتا تھا۔

لیکن یکایک اُس نے جرمن زبان بولنی شروع کر دی۔ پھر اُس نے سمندر کے اُس روشن ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کے ساتھ نیلی نیلی لہریں آہستہ آہستہ ٹکرا رہی تھیں "سنو! اس منظر کو دیکھ کر ایک مصنفہ کی وہ حیرت انگیز سطور میری نظروں کے سامنے آگئی ہیں جو اُس نے اپنے ایک خواب کے متعلق اپنے محبوب کے نام لکھی تھیں اور جو کبھی اُس تک نہ پہنچ سکیں"۔ اور پھر جرمن زبان میں اُس نے وہ "حیرت انگیز سطور" دہرانی شروع کیں۔

"میں نے ایک صاف شفاف سمندر دیکھا جس کے اوپر آسمان نے اپنی انتہائی بلندی سے سایہ کر رکھا تھا۔ دو شخص ساحل کے قریب ہی بیٹھے تھے، اور اُن پر نوجوانی کا ایک سحر سا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔۔"

سیرافینو جرمن زبان نہ جانتا تھا اس لئے کچھ نہ سمجھ سکا، لیکن جب وہ بول رہی تھی تو اُس کے ہونٹ اس قدر خوبصورت معلوم ہوتے تھے کہ وہ اُس کی طرف اِس طرح دیکھنے لگا جیسے کوئی پیاسا آدمی رس بھرے پھل کی طرف دیکھتا ہے۔

بہت جلد الزبتھ کی نگاہیں اس کی نگاہوں کا جواب دینے لگیں۔ سیرافینو نے اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ محبت کے دھوکے میں گرفتار نہ ہوگا بلکہ اپنی غریبانہ تمکنت کو قائم رکھے گا۔ لیکن اُس نے معصومانہ انداز میں کہا:

"کیا آپ اطالوی زبان میں ان الفاظ کا ترجمہ کریں گی؟"

الزبتھ نے ترجمہ کر دیا۔

× × × × × × ×

اُسی لمحے سے سیرافینو نے اپنی غریبانہ تمکنت کھونی شروع کی۔ الزبتھ نہ صرف اُس سے محبت کر رہی تھی بلکہ سیرافینو

کو محبت کرنے کی دعوت بھی دے رہی تھی۔ سیرافینو بھی اتنا بے پروا نہیں تھا کہ اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھاتا۔ صرف اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ ابتدا کیونکر کرنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ وہمی بھی تھا۔

الزبتھ کون تھی؟ وہ کہاں سے آئی تھی؟ کیا وہ رشتۂ ازدواج سے آزاد تھی؟ کیا وہ نیک چلن تھی؟ وہ کیا مشکل تھی جس کا اُس نے ایک دفعہ حوالہ دیا تھا؟

تمام دن وہ بیگنولی کی سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی اُنہوں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں اکٹھے کھایا۔ اس کے بعد وہ نسیڈا کی طرف روانہ ہوگئے۔ بہار کی ہلکی ہلکی نسیم چل رہی تھی۔ سمندر کی ہلکی ہلکی لہریں نیلے اور سنہری پھولوں کے بڑے بڑے ہاروں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ سبز پہاڑیاں اور نیلے جزیروں کے اوپر سنہری بادلوں کی ایک کور تنگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن الزبتھ جس کا خوبصورت عکس سمندر کے آئینے میں پڑ رہا تھا مغموم تھی اور اُس کے خیالات کہیں دور پہنچ چکے تھے۔ شاید وہ سیرافینو کی موجودگی کو بھی محسوس کر رہی تھی۔

نسیڈا قریب آگیا۔ آہستہ آہستہ ایک اُلٹے ہوئے ستارے سے اس کی مشابہت جاتی رہی۔ رنگین مکانات، نیلی نیلی چٹانیں، زندہ موت کا سفید مسکن لمحہ بہ لمحہ قریب آرہے تھے۔

جب کشتی جزیرے کے ساحل سے آلگی تو الزبتھ نے نظر اُٹھا کر پہاڑ کی طرف دیکھا۔ اُس کے بعد کنارے پر جانے کے لئے سیرافینو کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی تقریباً ہر رومان میں ایک باب ایسا ہوتا ہے کہ دو والہانِ الفت کسی پُرانے قلعے میں یا کسی عجائب خانے میں یا کسی دیہاتی معبد میں جاتے ہیں۔ مصنف کو اس طرح اپنی حسن کاری کی نمائش کا موقع ملتا ہے اور محبت کرنے والوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا۔ لیکن میں نہیں سمجھتی کہ کوئی دو جنونی ہماری طرح کسی زنجیر خانے میں بھی گئے ہونگے۔

سیرافینو نے بیدم ہوکر کہا "یہ سچ ہے"!

اُس کی آواز میں ایک لرزش تھی، اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ الزبتھ کیا کہنے لگی تھی؟ کیا اظہارِ مدعا کا وقت آگیا تھا؟ اب وہ اُس سڑک پر آگئے تھے جو دونوں طرف سے دو دیواروں سے گھری ہوئی تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر آہنی دروازوں سے منقطع ہوجاتی تھی۔

اب صرف اتنی ضرورت تھی کہ سیرافینو ایک ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی آغوش میں لے لے — اور یہی اب اُس کی انتہائی آرزو تھی، مگر اُس کو اس کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے الزبتھ مذاق کر رہی تھی — ہاں یہ ممکن بھی نہ تھا کہ وہ حقیقت میں اُس سے محبت کرتی ہو۔

یکایک سڑک مڑ گئی اور آگے ایک چٹانی ڈھلوان آگئی جس کے نیچے سمندر آہستہ آہستہ آہیں بھر رہا تھا۔

الزبتھ ٹھہر گئی اور پُرخیال آنکھوں سے نیچے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کہا "کیا وہ اس قسم کا کوئی مقام تھا؟"

سیرافینو نے کہا۔ "ہاں"

اُسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ کس طرح اُس کی تمام گزشتہ زندگی اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گئی۔ اور اب؟ اب وہ محبت کر رہا تھا، بلکہ شاید محبوب تھا — ایک خوبصورت اور ذہین لڑکی کے پہلو بہ پہلو کھڑا تھا جو سمندر کی لہروں کی

طرح، سفید سفید بادلوں کی طرح، اور چہچہانے والے پرندوں کی طرح دور، دور سے آئی تھی، اور جو شاید اپنا تمام حسن اور اپنی تمام دولت اُس کے ایک لفظ پر نثار کر دینے کو تیار تھی۔

سیرافینو نے یکایک بے اختیار ہو کر اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

الزبتھ نے اپنا سر پُرغرور انداز میں اوپر اُٹھایا۔ سیرافینو اُس کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ رو رہی تھی۔

سیرافینو نے کہا "ہائے تم کیوں رو رہی ہو؟ مجھے معاف کر دو۔ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ لیکن صرف ایک لفظ میں مجھے اتنا بتا دو کہ تمہیں میری کچھ پروا ہے کہ نہیں ــــ پھر اگر تم چاہو تو میں اپنی صورت تمہیں کبھی نہیں دکھاؤں گا ــــ کبھی نہیں ــــ کبھی نہیں"۔ غم کے وفور میں ایک بچے کی طرح اُس نے ان الفاظ کو دہرایا۔

الزبتھ نے ایک دفعہ پھر اپنے گال کو اُس کے گال سے لگا کر کہا "یہ بات نہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں ایک اور وجہ سے رو رہی ہوں۔ لیکن وہ میں تمہیں ابھی بتا دینا چاہتی ہوں ورنہ پھر کبھی نہ بتا سکوں گی۔ تمہیں معلوم ہے، وہ بوڑھا آدمی جس نے اِس دنیا کی جہنم سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور ایک پہرہ دار کے ہاتھوں مارا گیا تھا میرا باپ تھا"

"الزبتھ ــــ الزبتھ"۔

سیرافینو کے چہرے پر موت کی سی زردی چھا رہی تھی۔ اُس کا نچلا ہونٹ خم کھا کر اکڑ گیا تھا۔ اُس کے منہ سے اس کے سوا اور ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔

الزبتھ نے کہا "یہی وجہ تھی کہ تمہاری دور افتادہ روح کی آواز نے میرے دل پر اثر کیا۔ اگر میرے باپ نے تم سے رحم کی التجا کی ہوتی تو تم ضرور اُس پر رحم کرتے ــــ اب تم مجھ پر رحم کرو"۔

لیکن نہیں، دراصل سیرافینو کو اُس کے رحم کی ضرورت تھی۔ وہ اُس کے پاس کھڑا اس خوف سے کانپ رہا تھا کہ الزبتھ کہیں اس کو چھوڑ نہ دے۔ وہ مسکرا پڑی ــ آنسوؤں سے اُس کی آنکھیں ابھی تر تھیں، اُس نے اپنے سر کو جھکا دیا تاکہ اُس کے ہونٹ سیرافینو کے ہونٹوں سے جا ملیں۔

(گزیز باڈ بلڈا)

منصور احمد

اس قصرِ الم میں کون لایا مجھ کو؟ کیوں نغمۂ بیش و کم سنایا مجھ کو؟

شیرینی میں کیوں یہاں چھپی ہے تلخی؟ کیوں زہر بھرا شہد کھلایا مجھ کو؟

ب

راحت کدہ

ہے عجیب حیرت افزا یہ طلسمِ زندگانی کبھی شامِ نامرادی کبھی صبحِ کامرانی
کبھی نالہ ہائے فرقت کبھی نغمہ ہائے اُلفت کبھی سوزِ نوحہ خوانی کبھی سازِ شادمانی
کبھی چشمِ خونچکاں ہے کبھی دل طرب نشاں ہے کبھی خونِ دل کی مے ہے کبھی جامِ ارغوانی
کبھی جوشِ مے پرستی ہیں نشاطِ رقصِ مستی کبھی مثلِ نیشتر ہے خلشِ غمِ نہانی

وہ مرا شبابِ رنگیں وہ شرابِ کیف آگیں وہ سیاہ مستیوں کی طرب آفریں کہانی
یہ نظارۂ جہاں تھا کہ جمالِ گلفشاں تھا یہ مرا ریاضِ دل تھا کہ بہشتِ شادمانی
مگر آہ! آج کیا ہے اِک شرر بجھا ہوا ہے یہی ایک داغ باقی ہے شباب کی نشانی
نہ وہ ساغر و سبو ہے نہ خروشِ ہاؤ ہو ہے نہ دماغِ آرزو ہے نہ ہوائے زندگانی

نہ خوشی نہ بیدلی ہے، نہ الم نہ شادمانی
یہ مگر فسوں گری ہے یہ فریبِ زندگی ہے

مری زندگی ہی کیا ہے! فقط اک حبابِ فانی
نہ تو عیش کو بقا ہے نہ الم ہی لافنا ہے

مرے قلبِ ناتواں نے بہت انقلاب دیکھے
کبھی پستیوں کی ذلت کبھی اوجِ آسمانی

کبھی تھی صنم پرستی، کبھی میکدے کی مستی
کبھی تھا طوافِ کعبہ کبھی شغلِ سبحہ خوانی

مگر اب عدم نشاں ہیں وہ مناظر اب کہاں ہیں
تھے تمام نقشِ باطل تھے تمام نقشِ فانی

مری جان و دل کی راحت! مری روح کی مسرت
تری شمعِ عشق کی ہے مرے دل میں ضَو فشانی

مرے عشق کا ترانہ ترے حُسن کا فسانہ
مرے سازِ دل میں پنہاں ہے سرودِ غیر فانی

مرا دل گدازِ الفت مری روح سازِ الفت
مرا سوز مستقل ہے مرا سازِ جاودانی

اثر صہبائی

آزادنگارستان اور داداجان

داداجان کے پارلیمان میں جانے کی کیفیت تو آپ دیکھ چکے۔ اب یہ دیکھئے کہ انہوں نے پارلیمان میں جاکر کیا کارہائے نمایاں کئے اور وہاں کے ممبروں سے ان کی کیسی گزری +

جب مسٹر اسپیکر کو معلوم ہوا کہ داداجان امن آباد کے رکنِ پارلیمان ہیں تو انہوں نے منتظمِ پارلیمان کو حکم دیا کہ ان نئے رکن کو حلف دیا جائے۔ منتظم صاحب اٹھے۔ یہ بہت بھاری بھرکم آدمی تھے۔ ڈاڑھی مونچھیں بالکل صاف تھیں۔ خالص انگریزی لباس پہنے ہوئے تھے اور اپنی ہر حرکت سے ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ میں بھی کوئی چیز ہوں اور پارلیمان کا انتظام بس میرے ہی دم قدم سے قائم ہے + بہت متانت سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے یہ مسٹر اسپیکر کی میز کے قریب آئے۔ اتنے میں گورنمنٹ کی موافق اور مخالف پارٹیوں کے ایک ایک ممبر بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر داداجان کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے تاکہ حسبِ قاعدہ ان کا تعارف کرائیں لیکن دونوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ حضرت کس پارٹی میں شریک ہیں، اس لئے ایک نے داداجان کی دائیں بانہہ پکڑی اور دوسرے نے بائیں۔ یہ سمجھے کہ ابھی جو گڑبڑ ہوئی تھی اس کی جواب دہی کے لئے مجھے گرفتار کیا جاتا ہے۔ جو صاحب ان کی دائیں طرف تھے ان کو تو انہوں نے ایسا دھکا دیا کہ وہ ریلوے کے ممبر پر جا پڑے اور دوسرے کو گھسیٹتے ہوئے دروازہ کی طرف بھاگے۔ ایک غل مچ گیا۔ پولیس والا جو دروازہ کے ایک بازو سے لگا کھڑا تھا یہ شور و غل سن کر دروازہ میں آ کھڑا ہوا۔ داداجان سمجھے کہ اب اس دروازہ سے نکلنا مشکل ہے وہ دروازہ چھوڑ دوسرے دروازے کا رخ کیا۔ جو ممبر صاحب ان کی بائیں بانہہ پکڑے ہوئے تھے وہ اس رخ بدلنے کی وجہ سے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور منتظمِ پارلیمان کے اوپر جا پڑے۔ مسٹر اسپیکر نے "آرڈر آرڈر" کے نعرے مارے۔ دو چار ممبروں نے داداجان کو سنبھالا۔ دو ایک نے منتظم صاحب کو اٹھایا۔ داداجان ہانپتے ہوئے مسٹر اسپیکر کی میز کے پاس لائے گئے اور کہنے لگے کہ "اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہاں یہ فساد ہونے والا ہے تو میں اپنا لٹھ ساتھ لاتا۔ قسم خدا کی دس بارہ کے سر پھوڑے بغیر کبھی گرفتار نہ ہوتا۔ خیر جاتے کہاں ہو۔ اب کی وہ خبر لوں گا کہ تمام عمر یاد رکھو گے۔ مذاق سمجھ لیا ہے" مسٹر اسپیکر نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ معزز رکن کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کو گرفتار کرنا مقصود نہ تھا بلکہ قاعدہ کی رو سے اس پارلیمان کے دو رکن حلف کے لئے ان کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ مجھے امید ہے کہ معزز رکنِ امن آباد اپنی اس زیادتی کے متعلق ان دونوں اراکین سے معافی چاہیں گے"+

داداجان۔ سچ ہے صاحب۔ میری غلطی ضرور ہے۔ مگر کیا ان دونوں بیوقوفوں کی بھی غلطی نہیں ہے۔ پہلے ہی کہہ دیا ہوتا کہ ہم اس لئے آئے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ آتے ہی ڈنڈا تھام لئے۔ وہ تو کہو کہ اس وقت میرے پاس لٹھ نہ تھا ورنہ اس غلط فہمی میں دونوں کے سر کھل جاتے

اچھا صاحب غلطی ہوئی۔ بھیجئے صاحب ان دونوں کو بھیجئے +

ان دونوں ممبروں نے یہ سوچ کر کہ خدا جانے گھوڑا چھوٹے ہاتھی چھوٹے دادا جان کو حلف دلانے سے انکار کر دیا آخر دو اور ممبر اپنی جگہ سے اٹھے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر مسٹر اسپیکر کی میز تک لے گئے۔ منتظم صاحب بھی کپڑے وپڑے جھاڑ قریب آئے مگر اب ان کی متانت میں کچھ فرق آ گیا تھا اور ذرا دور ہی دور رہنا چاہتے تھے۔ بہر حال انہوں نے نہایت نپے تلے الفاظ میں فرمایا کہ "سیدھا ہاتھ اٹھائیے"۔

دادا جان۔ کیوں؟

منتظم۔ قسم کھانے کے لئے۔

دادا جان۔ قسم منہ سے کھائی جاتی ہے یا ہاتھ سے۔

منتظم۔ یہاں کا یہی طریقہ ہے۔

دادا جان۔ اگر طریقہ ہے تو غلط طریقہ ہے۔ بدل دو ہم ہاتھ واتھ کچھ نہیں اٹھاتے۔

منتظم۔ اٹھانا پڑے گا۔

دادا جان۔ کیا کہا۔ اٹھانا پڑے گا۔ ہے کسی میں ہمت جو زبردستی میرا ہاتھ اٹھوا سکے۔ ابھی منٹ بھر میں ٹھیک کر دوں۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن کو پھر غلط فہمی ہوئی ہے۔ ملک کا یہ قانون ہے کہ حلف لینے کے لئے ہاتھ اٹھایا جاتا ہے +

دادا جان۔ اچھا یہ بات ہے تو لو ہم ہاتھ اٹھائے لیتے ہیں۔

منتظم۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہوں۔

دادا جان۔ اور وہ کون مسخرا ہے جو خدا کو حاضر و ناظر نہیں جانتا۔ تم حلف دے رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔ اپنی عمر دیکھو اور میری عمر دیکھو۔ تمہارے دادا کے برابر ہوں۔ مجھ سے مذاق کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔ خاموش۔

دادا جان۔ لیجئے یہ دوسرے عقلمند بولے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ بولو۔ دوسرے فرماتے ہیں کہ خاموش رہو سبحان اللہ کیسے تماشے کے آدمی اس پارلیمان میں جمع ہو گئے ہیں +

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکنِ امن آباد کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اس وقت پارلیمان میں ہیں۔

دادا جان۔ آپ کو بھی خیال رکھنا چاہئے کہ میں اندھا نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں پارلیمان میں ہوں۔ پھر یہ بے معنی بات کہنے سے کیا مطلب ہے کہ تم پارلیمان میں ہو +

مسٹر اسپیکر۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی گفتگو سے یہاں احتراز کیا جائے۔

دادا جان۔ کیوں۔ آخر وجہ۔ کیا سچی بات بھی کہنا یہاں گناہ ہے۔ اُلٹی سیدھی آپ لوگ باتیں کر رہے ہیں یا میں۔ ایک

صاحب کہتے ہیں کہ ہاتھ اٹھا کر کہو کہ میں خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہوں۔ دوسرے صاحب کا ارشاد ہوتا ہے کہ خاموش رہو۔ تم لوگوں نے کیا مجھے دیوانہ سمجھا ہے +

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن کی مہربانی ہوگی اگر وہ قانون کی پابندی کریں اور جو کچھ منتظم پارلیمان کہیں ان کے الفاظ کو دہرائیں +

داداجان۔ بہت خوب میں خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہوں +

منتظم۔ اور حلف کرتا ہوں۔

داداجان۔ اور حلف کرتا ہوں۔

منتظم۔ کہ ملک کی خدمت ایمانداری سے کروں گا۔

داداجان۔ اور ملک کی خدمت کوئی بے ایمانی سے بھی کرتا ہے۔ واللہ کیا اچھا حلف ہے۔

منتظم۔ آپ فرمائیے۔

داداجان۔ فرماؤں کیا خاک۔ تمہاری کوئی بات ٹھکانے کی ہو تو کچھ فرماؤں۔ خدا کی قسم کیا عجیب وغریب فقرہ ہے کہ میں ملک کی خدمت ایمانداری سے کروں گا +

منتظم۔ میں ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا۔

داداجان۔ یہ پہلے فقرہ سے بھی کچھ زیادہ زور کا فقرہ ہے۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اس کے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر قوانین کی پابندی نہ کروں گا تو جیل خانے نہ جاؤں گا۔ تم لوگ جب حلف کی چار سطروں میں اتنی غلطیاں کرتے ہو تو خدا جانے قانون بنانے میں کیا کچھ بیوقوفیاں نہ کرتے ہوگے +

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اس وقت پارلیمان میں ہیں۔

داداجان۔ آخر یہ فقرہ کتنی دفعہ کہا جائے گا۔ پارلیمان نہیں تو کیا میں کسی قبرستان میں کھڑا ہوں۔

مسٹر اسپیکر۔ منتظم صاحب حلف کی تکمیل ہوگئی۔ آپ ان سے دریافت کیجئے کہ یہ دائیں جانب کے ارکین میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بائیں جانب کے ارکین میں۔

داداجان۔ کیا فرمایا یہ دائیں بائیں ارکین کون بلا ہیں۔

منتظم۔ دائیں جانب کے جو ارکین ہیں وہ موجودہ گورنمنٹ کے موافق ہیں اور بائیں جانب کے خلاف۔

داداجان۔ تو ملک کے مخالفوں کو یہاں رہنے ہی کیوں دیا ہے۔ مار کر نکال باہر کرو۔ . . . . غضب خدا کا یہ لوگ ملک کے خلاف ہوں اور پارلیمان میں رہیں (مسٹر اسپیکر کی طرف اشارہ کرکے) یہ سب آپ کی کمزوری ہے ذرا مجھے اپنی جگہ بیٹھا دیجئے۔ ابھی سب مخالفوں کے کان پکڑ کر باہر کئے دیتا ہوں۔

بائیں جانب کے ارکین۔ مسٹر اسپیکر ذرا اس گفتگو کو نوٹ کیا جائے +

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔

دادا جان۔ نوٹ کیوں کرو۔ پولیس میں رپٹ لکھوا دو۔ میں تم نمک حراموں سے کوئی دبنے والا تھوڑا ہی ہوں (مسٹر اسپیکر کی طرف اشارہ کرکے) اِس بچارے غریب کو دبا کر شیر ہو گئے ہو۔ یاد رکھنا میں بھی پٹھان ہوں۔ ابھی سب نوٹ ووٹ ناک کے رستے نکال دونگا

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکنِ امن آباد کو پھر غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسی مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے لازمی ہے کہ اس کے موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔ اسی لئے ہر پارلیمان میں گورنمنٹ کے مخالف ارکین کا ہونا ضروری ہے +

دادا جان۔ یہ کچھ عجیب بات ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ غلط فہمی سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر فرقہ بندیاں کئے کسی مسئلہ کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈالی جا سکتی۔ خیر سنئے۔ میں آپ کے کسی فرقہ میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ میں آزاد ہوں اور آزاد ہی رہوں گا +

مسٹر اسپیکر۔ آپ کو آزاد ارکین کے بنچوں پر جگہ بتا دی جائے۔

منتظم نے پارلیمان کے وسطی بنچوں کی طرف اشارہ کر دیا اور دادا جان نہایت متانت سے ٹہلتے ہوئے جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ اُن کے برابر ایک دوسرے صاحب بیٹھے تھے۔ بہت زرق برق لباس تھا۔ ناک پر گول تالوں کی بڑی عینک تھی سر ننگا تھا اور اس طرح آنکھیں بند کئے ہوئے تھے گویا اونگھ رہے ہیں یا کچھ سوچ رہے ہیں۔ دادا جان کے بیٹھ جانے کے بعد پارلیمان کی کارروائی پھر شروع ہوئی +

وزیر مالیہ۔ میں نے اس وقت تک جو کچھ عرض کیا ہے وہ آپ صاحبوں کے ذہن میں ہوگا لیکن اس خیال سے کہ میری بحث میں معزز رکنِ امن آباد کے حلف لینے کی کارروائی کے باعث تسلسل قائم نہیں رہا ہے میں از سرِ نو اپنی بحث کو مختصراً عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ریلوں کے جو فوائد ہیں ان کے اظہار کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس کی وجہ سے قحط کا انتظام ہو سکتا ہے یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ملک میں خوشحالی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے تجارت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ بغرض کوئی ملک ترقی کے میدان میں نہیں آسکتا جس میں ریلوں کا جال نہ بچھا دیا جائے۔ گورنمنٹ کا فرض ہو کہ وہ سب سے پہلے ملک کے دور و دراز حصوں کو ریل کے ذریعہ سے ملانے کی کوشش کرے تاکہ ذرائع آمد و رفت کی سہولت نہ صرف ملک میں تجارت بڑھانے کا باعث ہو، بلکہ آپس کے میل جول سے مُلک میں امن قائم رکھا جا سکے +

یہاں امن کے ذرائع بتائے جا رہے تھے اور ادھر دادا جان کے بنچ سے غل اٹھا کہ "مار ڈالا۔ مار ڈالا" اب جو دیکھتے ہیں تو دادا جان اپنے برابر والے رکن کو دبائے گدگدیاں کر رہے ہیں اور وہ ہے کہ چیخوں پر چیخیں مار رہا ہے۔ اوپر کی گیلری میں سے جو لوگ جھک کر یہ تماشا دیکھنے لگے تو ایک صاحب کا جھوک نکل گیا۔ گرے اور گرتے گرتے انہوں نے بجلی کے جھاڑ کو پکڑ لیا۔ کئی بجلی کے گولے دنادن کرکے پھٹے کئی کنول اور قلمیں ٹوٹ کر نیچے گریں۔ اب یہ ہیں کہ جھاڑ میں لٹکے جھولا جھول رہے ہیں اور مخالف پارٹی والے اس ڈر سے کہ کہیں گرفت ڈھیلی ہو کر یہ ہم پر نہ آپڑیں اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ غرض ایک اودھم مچ گیا۔ ایک ممبر صاحب شراب پیے بیٹھے تھے وہ اٹھے اور کہنے لگے:-

شرابی رکن۔ مسٹر اسپیکر۔ مسٹر اسپیکر۔ ایک۔ سوال۔ بڑا۔ ضروری۔ سوال۔
مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔ خاموش۔
شرابی رکن۔ ہم۔ ہم۔ ہم۔ سوال۔ کا۔ جواب لے کر۔ خاموش ہوں گے۔ ایک سوال۔ بڑا ضروری سوال۔
مسٹر اسپیکر۔ فرمائیے کیا سوال ہے؟
شرابی رکن۔ سوال یہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس رستہ سے یہ شخص (جھاڑیں لٹکے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کر کے) یہ شخص اوپر سے آرہا ہے۔ وہ کیا۔ وہ کیا۔ اس پارلیمان کے ضابطہ کے۔ موافق ہے +
مسٹر اسپیکر۔ یہ کوئی سوال نہیں ہے۔
شرابی رکن۔ یہ۔ یہ۔ بہت۔ اہم۔ سوال۔ ہے۔ آپ کو۔ آپ کو۔ اس کا۔ اس کا۔ تصفیہ کرنا ہو گا +
بائیں جانب کا ایک رکن۔ معزز رکن مخمور نگر شراب پئے ہوئے ہیں۔ ان کا اس حالت میں یہاں آنا پارلیمان کی توہین کرنا ہے +
شرابی رکن۔ ہم اپنے داموں سے ہم اپنے داموں سے پی کر۔ آئے ہیں کسی کے باپ کا دینا۔ دینا۔ نہیں آتا۔ تم۔ تم۔ ہمارے پینے سے جلتے ہو۔ جلتے ہو۔
بائیں جانب کے کئی اراکین۔ نکالو۔ اس شرابی کو نکالو۔
شرابی رکن۔ (آستین چڑھا کر) آؤ۔ تم آؤ۔ ہمت ہے۔ تو۔ تم۔ آؤ۔ ابھی۔ ابھی کچومر نکال دیتا ہوں۔ ہم۔ ہم۔ گورنمنٹ کے آدمی ہیں۔ کوئی۔ ہم کو۔ نکال۔ سکتا ہے؟
بڑی مشکل سے ان شرابی رکن کے ایک پارٹی والے نے ان کو زبردستی بنچ پر بٹھا دیا۔ اس گڑبڑ میں راداجان کے بنچ کی آواز ذرا دب گئی تھی۔ جب ان شرابی صاحب کی آواز ذرا دھیمی ہوئی تو اُدھر سے مار ڈالا۔ مار ڈالا کا غل پھر شروع ہوا۔ شرابی صاحب نے مڑکر اُدھر دیکھا اور پھر کھڑے ہو گئے۔
شرابی رکن۔ ایک سوال ہے۔ بہت ضروری۔ سوال ہے +
مسٹر اسپیکر۔ اب آپ کا کیا سوال ہے +
شرابی رکن۔ آپ۔ آپ۔ ذرا۔ اونچی کرسی پر۔ اونچی کرسی پر۔ بیٹھے ہیں۔ مہربانی کر کے۔ مہربانی کر کے مطلع فرمائیے۔ ہم سب کو مطلع فرمائیے کہ ان دونوں رکنوں میں اوپر کون ہے۔ اور نیچے کون ہے۔
مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن مخمور نگر کو ایسے سوالات سے پرہیز کرنا چاہئے۔
شرابی رکن۔ میں۔ میں۔ بڈھے کی طرف ہے۔ چار۔ اور۔ ایک کی شرط۔ چار اور ایک کی شرط باندھتا ہوں۔ مسٹر اسپیکر۔ مسٹر اسپیکر۔ آپ کو۔ آپ کو منظور۔ ہے؟

مسٹر اسپیکر۔ آرڈر۔ آرڈر!

بہرحال پولیس نے آکر ان صاحب کو جو جھاڑیں لٹکے ہوئے غل مچا رہے تھے۔ نیچے اُتارا۔ ان شرابی رکن کو اپنی جگہ بٹھایا۔ دادا جان کے پنجہ سے ریا پور کے ممبر کو رہائی دلائی۔ پارلیمان میں ذرا امن ہوا اور اس کے بعد مسٹر اسپیکر نے کہا:۔

مسٹر اسپیکر۔ آج جس قدر بیہودگی اس اجلاس پر ہوئی ہے اس کے متعلق اراکین امن آباد۔ ریا پور اور مخمور نگر کو شرمندہ ہونا چاہیئے اور بتانا چاہیئے کہ اس طرح اپنے ملک کی پارلیمان میں ان کو نہ صرف اپنی حد سے بڑھنے بلکہ شرافت کی حد سے تجاوز کرنے کی کیا وجہ تھی۔ پہلے میں معزز رکن امن آباد کا جواب اس کے متعلق سننا چاہتا ہوں +

دادا جان۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ (رکن ریا پور کی طرف اشارہ کرکے) اس بیوقوف سے پوچھو۔ میں حلف لے کر اپنے بنچ پر آکر بیٹھا تو اُس نے میری پسلی پر گدگدی کی۔ میں نے اس کو غور سے دیکھا کہ شاید کبھی کی جان پہچان ہو۔ بہت غور کیا مگر یاد نہ آیا کہ یہ کون شخص ہے۔ چپکا ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے میری پسلیوں میں پھر انگلی چھوئی۔ میرے بھی اس خیال سے کہ جب یہ مذاق کر رہا ہے تو میں کیوں نہ کروں۔ اس کے گدگدیاں کیں اور چپکا ہو رہا۔ اس نے تھوڑی دیر میں پھر گدگدی کی۔ میں نے بھی جواب میں گدگدیاں کرنی شروع کر دیں۔ اُس نے میرے چٹکی لی۔ میں نے بھی چٹکی لی۔ اس پر اُس نے میرے ایک مکا مارا۔ بھلا میں کوئی اس کا دبیل تھا جو مکا کھا کر چپکا ہو رہتا۔ وہیں دبوچ لیا اور اچھی طرح ہڈیاں پسلیاں نرم کریں۔ مزا تو دیکھئے کہ مذاق تو خود شروع کیا اور خود ہی مر گیا مر گیا۔ کا غل مچایا۔ اگر لڑنے کا دم نہ تھا تو یہ چھیڑ خانی شروع ہی کیوں کی تھی۔ اب آپ ہی دیکھئے کہ بیہودگی اس نے کی یا میں نے ؟

مسٹر اسپیکر۔ اب براہ کرم معزز رکن ریا پور اپنے افعالِ غیر پارلیمانہ کی جواب دہی فرمائیں۔

رکن ریا پور۔ مسٹر اسپیکر۔ میں رکن امن آباد کے اس غیر شریفانہ برتاؤ کے متعلق اپنے ملک کی پارلیمان سے طالب امداد و انصاف ہوں۔ جو ظلم اس وقت مجھ پر ہوا ہے اور جو تکلیف جسمانی اور روحانی اس وقت مجھے پہنچی ہے وہ اس قابل ہے کہ مجھے رکن امن آباد کے خلاف عدالتی چارہ کار اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب رکن امن آباد حلف لے کر میرے برابر آکر بیٹھے تو جس بنچ پر یہ بیٹھے اس پر میری ٹوپی پڑی ہوئی تھی۔ وہ ان کے بھاری جسم کی وجہ سے بالکل پچک گئی۔ میں نے ان کی پسلی میں اُنگلی مار کر ان کو توجہ دلائی کہ آپ میری ٹوپی پر بیٹھ گئے ہیں اور بجائے اس کے کہ یہ معافی مانگ کر اٹھتے اور ٹوپی نکال کر مجھے دیتے انہوں نے میرے گدگدیاں کرنی شروع کر دیں۔ اس کے بعد میں نے اس خیال سے ان کے چٹکی لی کہ شاید یہ اٹھیں اور میں جلدی سے ان کے نیچے سے ٹوپی نکال لوں۔ لیکن بجائے اٹھنے کے انہوں نے میرے اس زور سے چٹکی لی کہ نیل پڑ گیا ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ اس پر واقعی میں نے ان کو مکا مارا۔ پھر جو انہوں نے مجھے مارا اور دبوچا ہے تو اب تک میری ہڈی ہڈی میں درد ہو رہا ہے۔ اگر پولیس والے آکر مجھے نہ چھڑاتے تو میرے مر جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ بس پھر کہتا ہوں کہ میں رکن امن آباد کے مقابلے میں اپنے ملک کی پارلیمان سے طالب امداد و انصاف ہوں +

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد تسلیم کریں گے کہ اُن کو اس معاملہ میں غلط فہمی ہوئی ہے اور اس لئے معافی اُن کو

مانگنی چاہیئے +

دادا جان۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے لئے یہ غلط فہمی کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں غضب خدا کا کہ میری کوئی بات اور میرا کوئی فعل آج غلط فہمی سے خالی نہیں ہے۔ اول تو کوئی ان عقلمند سے پوچھے کہ ان کو ٹوپی اتار کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر ٹوپی اتار کر بیٹھے بھی تھے تو اپنے بنچ پر رکھنے کی بجائے یہ ٹوپی دوسرے بنچ پر کیوں رکھی تھی۔ اور رکھی بھی تھی تو جب میں اس بنچ پر بیٹھنے لگا تو اٹھا کیوں نہ لی۔ کوئی میری، گدی میں آنکھیں تو ہیں نہیں کہ میں دیکھ لیتا کہ بنچ پر کسی کی ٹوپی رکھی ہوئی ہے اور بالفرض محال میں ٹوپی پر بیٹھ ہی گیا تھا تو انہیں زبان ہلاتے کیوں شرم آئی۔ طلب امداد و انصاف کے لئے تو انہوں نے لمبی چوڑی تقریر کردی۔ اور اس وقت آہستہ سے کہا گیا کہ "جناب آپ میری ٹوپی پر بیٹھ گئے ہیں"۔ کیا شریف آدمی اس طرح پسلیوں میں انگلیاں مار مار کر متوجہ کیا کرتے ہیں۔ کیا بھلے مانس اسی طرح چٹکیاں لیا کرتے ہیں جس طرح ان حضرت نے لی ہیں۔ اور کیا باوجود اسی بیہودگیاں کرنے کے اس پارلیمان کے رکن اسی طرح لپاڈگی پر اتر آتے ہیں جیسا ان معزز رکن ریاپور نے کیا۔ خود ہی یہ کچھ اودھم مچائیں اور خود ہی انصاف، انصاف کے نعرے لگائیں اور آپ کو دیکھئے کہ پارلیمان کے اسپیکر بن کر بیٹھے ہیں اور سمجھیں نہ بوجھیں ہر بات پر یہی کہتے ہیں کہ رکن امن آباد کو غلط فہمی ہوئی ہے[1]

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد نے واقعات کی جو صراحت اس وقت کی ہے اس کے لحاظ سے مجھے امید ہے کہ معزز رکن ریاپور اب اس کارروائی کو طول دینا مناسب نہ خیال فرمائیں گے +

رکن ریاپور۔ مسٹر اسپیکر۔ میں آپ کے تصفیہ کو قبول کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ میرے شریک کار یعنی معزز رکن امن آباد اب اس واقعہ کو بھول جائیں گے اور میں بھی سمجھوں گا گویا یہ واقعہ ہوا ہی نہیں +

دادا جان۔ مجھے یقین ہے کہ معزز رکن ریاپور اتنی جلدی اس واقعہ کو نہ بھول سکیں گے۔ کیونکہ جو جسمانی تکلیف ان کو پہنچی ہے وہ عرصہ تک ان کو ہمارے اس "اختلاف" کی یاد دلاتی رہے گی۔ بہرحال چونکہ یہ خود اس کارروائی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اس لئے مجھے بھی کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں رہی لیکن میں ان سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ جو کچھ ان کو مجھ سے کہنا ہو وہ زبان سے کہیں اور اس طرح انگلیاں چبھونے اور چٹکیاں لینے سے احتراز کریں ورنہ کہیں پھر مسٹر اسپیکر آپ کو یہ نہ کہنا پڑے کہ اس میں رکن امن آباد کو غلط فہمی ہوئی ہے +

---

[1] اوپر جو کچھ گڑبڑ لکھی گئی ہے اس کو شاید بعض قارئین کرام محض مذاق سمجھیں مگر ان کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ سب واقعات ایک بہت بڑے اور مہذب ملک کی پارلیمان میں پیش آچکے ہیں میں نے رنگ آمیزی ضرور کی ہے لیکن واقعات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ کو فرانس کی پارلیمنٹ کا وہ واقعہ تو یاد ہی ہوگا جہاں کچھ ہی عرصہ گزرا کہ "لپاڈگی" تو کیا خوب "سر پھٹول" ہو چکی ہے۔ اب رہی زبان کی لڑائی تو وہ اکثر پارلیمنٹوں میں روزانہ ہوتی رہتی ہے۔ اور سچ بھی ہے اگر یہ دلچسپیاں نہ ہوں تو پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں اتنی دیر بیٹھنا عذاب جان ہو جائے +

مسٹر اسپیکر۔ چونکہ یہ افسوسناک واقعہ بخیر و خوبی ختم ہوگیا اس لئے اب اجلاس کی کارروائی شروع کی جائے۔

وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر۔ مجھے حکومتِ سابقہ میں ایک عرصہ تک ملک کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے اور مجھے فخر ہے کہ گزشتہ دس سال سے میں معزز پارلیمان میں مختلف حیثیتوں سے شریک رہ چکا ہوں لیکن جس طرح آج میری گفتگو میں دراندازی ہو رہی ہے اور جس طریقہ سے آج بعض معزز اراکین اس گفتگو میں وقفے پیدا کر رہے ہیں وہ صورت کبھی پیش نہیں آئی تھی اور مجھے امید ہے اور میں توقع کرتا ہوں کہ آپ کی صدر نشینی کے دوران میں آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی (دائیں بنچوں سے آوازیں آئیں۔ ہیر، ہیر) میں اپنی بحث میں یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ملک کے ذرائع آمدنی بڑھانے اور ملک میں امن قائم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ریل ہے

رکن شورش آباد۔ اگر قیامِ امن کا ذریعہ ریل ہے تو سب سے پہلے اس کو ہماری پارلیمان کے کمرے میں بچھانے کی ضرورت ہے

مسٹر اسپیکر۔ آرڈر۔ آرڈر۔

وزیر مالیہ۔ مجھے اپنی ریل کا رخ بدل کر معزز رکن شورش آباد کے گھر میں سے اس کو نکالنا پڑے گا۔ کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے پارلیمان کی بہ نسبت ان کے گھر میں امن کی زیادہ ضرورت ہے (بائیں جانب کے اراکین۔ شرم۔ شرم۔ وزیر مالیہ کو اپنے الفاظ واپس لینے چاہئیں)

مسٹر اسپیکر۔ آرڈر۔ آرڈر۔

وزیر مالیہ۔ بہرحال اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد کہ ملک کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ریلوں کا جال بچھانا گورنمنٹ کا اہم ترین فرض ہے۔ میں اپنی اسکیم معزز اراکینِ پارلیمان کے سامنے پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارا شہر امن آباد ایک ایسا شہر ہے کہ نہ صرف وہاں کے باشندوں کو بلکہ تمام ملک کو اس پر فخر ہے اور بجا طور پر فخر ہے (دادا جان۔ ہیر، ہیر) کیا بلحاظ اُن کی اخلاقی جرأت کے اور کیا بلحاظ شوقِ ترقی کے (دادا جان ہیر، ہیر) اور گورنمنٹ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرے گی اگر ان باہمت لوگوں کو ترقی کرنے کا موقع نہ دے یا ان کے لئے ترقی کے ذرائع پیدا نہ کرے (دادا جان، ہیر، ہیر) اور مجھے پوری توقع ہے کہ جو اسکیم میں اس وقت پیش کر رہا ہوں اس کو منظور کرانے میں میرے معزز دوست مسٹر دادا جان میری پوری مدد فرمائیں گے (دادا جان۔ ضرور۔ بالضرور) جس طرح امن آباد ایک قابل قدر شہر ہے اسی طرح نیکی پور کا شہر بھی۔

دادا جان۔ نیکی پور شہر نہیں ہے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

وزیر مالیہ۔ میں اپنے معزز دوست کی اس رہبری کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرا مطلب بھی لفظِ "شہر" سے "گاؤں" ہی تھا۔

رکن نیکی پور۔ آپ غلط کہتے ہیں۔ کیا بلحاظِ آبادی۔ کیا بلحاظِ مالگزاری اور کیا بلحاظِ تعلیم ہمارا شہر نیکی پور ان بڑے میاں کے گاؤں امن آباد سے بہت بڑھا ہوا ہے۔

دادا جان۔ کیا کہا۔ ذرا پھر تو کہنا۔ ہمارا شہر گاؤں ہے۔ اسپیکر صاحب۔ پارلیمان کی کارروائی بند کیجئے اور دونوں جگہ کے پٹواریوں کے کاغذات منگوا کر پہلے اس کا تصفیہ کیجئے کہ ہمارا شہر گاؤں ہے یا اس بیوقوف کا۔

رکن نیکی پور۔ بیوقوف کس کو کہا۔ اب آ کر بتاؤں۔ بدمعاش کہیں کا۔

مسٹر اسپیکر۔ میں دونوں معزز اراکین پر ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ اس وقت ملک کی پارلیمان میں ہیں (ایک جانب سے آوازیں آئیں ان دونوں بڈھوں نے پارلیمان کو اپنے گاؤں کی چوپال سمجھا ہے۔ گیلری سے آوازیں آئیں "کاغذات منگوانے کی بجائے ان دونوں کے ہاتھوں میں لٹھ دے دو۔ ابھی معلوم ہو جاتا ہے کہ امن آباد شہر ہے یا نیکی پور)۔

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔ آرڈر۔ آرڈر۔ معزز وزیر مالیہ اپنی بحث شروع کریں۔

وزیر مالیہ۔ میری اسکیم کو اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ امن آباد شہر ہے یا نیکی پور۔ اگر یہ دونوں شہر ہیں تو اس اسکیم سے یہ دونو بڑے شہر ہو جائیں گے۔ اگر گاؤں ہیں تو قصبہ ہو جائیں گے اگر قصبہ ہیں تو شہر ہو جائیں گے۔ بہرحال اسکیم یہ ہے کہ ریل کی جو دو لائنیں ان دونوں اسٹیشنوں پر سے گزرتی ہیں ان کو ایک لائن ڈال کر ملا دیا جائے۔

داداجان۔ اس سے فائدہ۔ ان دونوں اسٹیشنوں کے بیچ میں آبادی ہی کون سی ہے جس کا مال اس ریل پر آئے گا یا مسافروں سے کوئی آمدنی ہوگی۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد کو یہ امور اپنی بحث کے لئے رکھنے چاہئیں۔ اس طرح معزز رکن کی بحث میں دخل دینا پارلیمانی طریقہ کے خلاف ہے۔

وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر میں آپ کی اس توجہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مجھے اپنے معزز دوست رکن امن آباد کے اس ریمارک کے متعلق بھی کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ انہیں ابھی تک تجربہ نہیں ہے کہ ریلوں سے کیا فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور کس طرح ان کے ذریعے سے غیر آباد ملکوں کو آباد کیا جا سکتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت امن آباد اور نیکی پور کا درمیانی حصہ غیر آباد ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ریل نکلنے کے بعد بھی وہ غیر آباد رہے گا۔

داداجان۔ ہاں میں کہتا ہوں کہ غیر آباد رہے گا کسی صحرائے لق و دق میں جہاں میلوں پانی کا نام و نشان نہ ہو۔ جہاں اناج تو کیا گھاس بھی پیدا نہ ہوتی ہو جہاں سر چھپانے کو درخت کا سایہ تک نہ ہو۔ جہاں آدمی تو کیا جنگلی جانور بھی رہنا پسند نہ کرتے ہوں ریل ڈالنے سے آبادی کی توقع کی جا سکتی ہے؟ یا تو (وزیر مالیہ کی طرف اشارہ کر کے) ان حضرت نے وہ حصہ دیکھا ہی نہیں۔ یا یہ جان بوجھ کر ہم سب کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد کو اس طرح بحث کے بیچ میں بولنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

داداجان۔ تو پھر آپ کا یہ مطلب ہے کہ یہ حضرت ہم سب کو بیوقوف بنائے جائیں اور ہم الوؤں کی طرح بیٹھے ان کا منہ دیکھتے رہیں۔

دائیں جانب کے ایک رکن۔ مسٹر اسپیکر۔ براہ کرم اس کا نوٹ کر لیا جائے کہ ہم الو نہیں ہیں معزز رکن امن آباد کو اس غلط بیانی کے متعلق معافی مانگنی چاہئے۔

داداجان۔ تم اُلّو نہیں تو اور کیا ہو۔ ایک شخص صریحاً جھوٹ بول کر تم کو دھوکا دے رہا ہو اور تم ذرا نہیں ٹوکتے۔ ہم کو اگر معلوم ہوتا کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد تم جیسے گدھے پارلیمان میں آئیں گے تو ہم آزادی کی جدوجہد میں ہرگز کوئی حصہ نہ لیتے (کسی طرف سے آواز آئی حصہ نہ لیتے تو جوتے کھاتے)

یہ سننا تھا کہ داداجان بنچ پر کھڑے ہو گئے۔ آستینیں چڑھالیں پگڑی ایک طرف پھینکی اور نہایت غضب ناک آواز میں کہا کہ ہی تم میں کوئی رُستم کا جنا ہُوا جو ہمارے جوتے مارے"

رکن مخمورنگر۔ مسٹر اسپیکر۔ مسٹر۔ اسپیکر۔ ایک سوال ہے۔ بہت۔ بہت۔ ضروری سوال۔ ہے۔

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔ خاموش۔

رکن مخمورنگر۔ ہم۔ ہم۔ خاموش۔ نہیں۔ ہو سکتے۔ ایک۔ سوال۔ ہے۔

مسٹر اسپیکر۔ آخر آپ کا کیا سوال ہے +

رکن مخمورنگر۔ آپ۔ آپ۔ پلیٹ فارم سے۔ اتر۔ آیئے۔ اور۔ اور۔ پہلے۔ پارلیمان کو۔ ان۔ بڑے میاں کی۔ کُشتی۔ دیکھنے۔ دیجئے۔ میں۔ میں۔ ان کی طرف سے۔ ان کی طرف سے۔ سو اور دس۔ کی شرط لگاتا ہوں۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن مخمورنگر کو اپنی حد سے تجاوز کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے +

رکن مخمورنگر۔ ملک کا فرض ہے۔ فرض ہے۔ کہ یہاں کے لوگوں کی ہمت ہمت۔ قائم رکھے۔ ریل والی اسکیم۔ نامنظور۔ خیر بڑی مشکل۔ سے داداجان کو سمجھا بجھا کر بنچ سے اُتار اگیا۔ رکن مخمورنگر کو پکڑ دھکڑ کر بٹھایا گیا۔ پارلیمان میں ذرا امن ہُوا اور پھر کارروائی شروع ہوئی +

وزیر مالیہ۔ میں اس فیصلہ کو معزز اراکین پارلیمان پر چھوڑتا ہوں کہ ریلوں کے نکلنے سے کیسا ہی غیر آباد ملک کیوں نہ ہو آباد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور امن آباد اور نیکی پور کے اسٹیشنوں کے بیچ میں لائن قائم کرنے سے اس حصّہ ملک کو ترقی دی جاسکتی ہے یا نہیں اور اب میں مالیہ کے نقطۂ نظر سے اس اسکیم کے فوائد آپ کو دکھانا چاہتا ہوں +

مجھ کو یہ ظاہر کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ ملک میں جو اسکیمیں تجارتی اصول پر قائم ہوتی ہیں۔ ان میں کوشش کی جاتی ہے کہ کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے اور ریلوں کے نکالنے میں یہ امر پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو کسی آبادی میں سے ان کو نہ گزارا جائے۔ کیونکہ وہاں کی اراضی قیمتی ہوتی ہیں اور معاوضہ بہت دینا پڑتا ہے اور ساتھ ہی اراضیٔ کاشت کے ریل میں آجانے سے مال گزاریٔ ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے اسکیم وہی زیادہ بہتر ہے جس میں ریل کو ویران حصۂ ملک میں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔

بائیں جانب کے ایک رکن۔ تو اس اصول کے لحاظ سے بہترین اسکیم یہ ہو گی کہ صحرائے اعظم میں ریلوں کا جال بچھا دیا جائے۔ کیونکہ وہاں نہ زراعت کا نقصان ہو گا اور نہ زمین کا معاوضہ دینا ہو گا +

وزیر مالیہ۔ وہ دن بھی دُور نہیں ہے +
وہ رکن۔ گھبرائیے نہیں۔ جہاں آپ جیسے وزیر ہوں۔ وہاں یہ ملک بھی تھوڑے دنوں میں صحرائے اعظم ہوجائے گا +
مسٹر اسپیکر۔ آرڈر۔ آرڈر۔ معزز اراکین کا اس طرح ایک دوسرے کو مخاطب کرنا خلافِ ضابطہ ہے +
وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر۔ میں اپنے اس غیر پارلیمانی طریقہ کے متعلق طالبِ معافی ہوں +
میری اسکیم کے تحت جو تخمینہ سررشتۂ ریلوے نے کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کو اس زمین کے لئے جس پر سے یہ ریل گزر رہی ہے اور جہاں دو اسٹیشن بھی قائم ہوں گے صرف تین لاکھ پچیس ہزار دو سو انتیس روپے نو آنے چھ پائی ادا کرنے ہوں گے +
دادا جان۔ کتنے روپے۔
وزیر مالیہ۔ صرف دو لاکھ پچیس ہزار دو سو انتیس روپے نو آنے چھ پائی +
دادا جان۔ اور ابھی چھ مہینے بھی نہیں گزرے کہ اتنا بڑا ٹکڑا تو کیا امن آباد اور نیکی پور کے بیچ کا سارا صحرائی علاقہ راجہ صاحب ویران آباد نے ایک انگریزن کے ہاتھ اٹھائیس ہزار روپے میں فروخت کیا ہے +ہاں وہ دیکھو عورتوں کی گیلری میں سیدھے ہاتھ کی طرف تیسرے نمبر پر جو عورت بیٹھی ہے اسی نے یہ علاقہ خریدا ہے۔ میں اس دستاویز کا گواہِ حاشیہ ہوں۔
وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر۔ مجھے امید ہے کہ معزز رکن امن آباد کو اس قسم کے حملوں سے روکا جائے گا +
بائیں جانب کے لیڈر۔ مسٹر اسپیکر۔ اس کارروائی نے جو شکل اختیار کر لی ہے اس کے لحاظ سے میں ایک سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کیونکہ جب تک اس سوال کا تصفیہ نہ ہوجائے گا اس وقت تک میری پارٹی والوں کو اس اسکیم کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع نہ ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ معاملہ کو صاف کرنے کے لئے مجھے اس سوال کی اجازت دی جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح وزیر مالیہ کی بحث میں میرا دخل دینا نامناسب ضرور ہے لیکن سوال کی اہمیت مجھے اس اجازت طلب کرنے پر مجبور کرتی ہے۔
مسٹر اسپیکر۔ آپ کو سوال کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔
وہ رکن۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا معزز وزیر مالیہ کی بیگم صاحبہ نے وہ علاقہ جس پر سے یہ ریل نکل رہی ہے راجہ صاحب ویران آباد سے اٹھائیس ہزار روپیہ میں تقریباً چھ ماہ قبل خریدا ہے؟
مسٹر اسپیکر۔ مجھے امید ہے کہ معزز وزیر مالیہ اس سوال کا جواب عنایت کر کے معزز رکنِ مخالف کی تشفی فرمائیں گے +
وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر۔ تجارت ہر شخص کا قانونی حق ہے۔ کوئی مہذب گورنمنٹ کسی شخص کو خرید و فروخت کا فائدہ حاصل کرنے سے روک نہیں سکتی۔ کامیاب تاجر وہی ہے جو وقت کو سمجھے۔ ملک کی ضرورت کو جانے اور اپنے روپے کا استعمال ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد اس طرح کرے کہ نقصان کی کوئی صورت پیدا ہونے کا اندیشہ نہ رہے +
بائیں جانب کے لیڈر۔ مسٹر اسپیکر۔ میں معزز وزیر مالیہ سے اصول تجارت معلوم کرنا نہیں چاہتا ورنہ مجھے

یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ تاجروں کو اپنا روپیہ کس طرح اور کس موقع پر خرچ کرنا چاہیئے۔ میرا سوال بالکل صاف ہے کہ "کیا معزز وزیر مالیہ کی بیگم صاحبہ نے وہ علاقہ جس پر سے یہ ریل نکل رہی ہے راجہ صاحب ویران آباد سے اٹھائیس ہزار روپے میں تقریباً چھ ماہ قبل خریدا ہے" جس طرح میرے سوال میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اسی طرح میں صاف صاف جواب کا طالب ہوں +

وزیر مالیہ - جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ صحیح ہے (بائیں جانب کے ارکین نے غل مچایا۔ "بدمعاش، غدار گورنمنٹ کو ایسے نمک حلال وزیر کی قدر کرنی چاہیئے")

وزیر مالیہ - لیکن شادی سے قبل جو رقوم میں نے اپنی بیگم صاحبہ کو دی تھیں۔ اس سے انہوں نے یہ علاقہ خریدا ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے (آوازیں آئیں "کسی صاحبزادے کے نام سے سمندر کا ٹکڑا خرید کر وہ بھی جہاز چلانے کے لئے گورنمنٹ کے ہاتھ بیچ ڈالیئے۔ نمک حرام، بدمعاش")

غرض پارلیمان میں ایک شور مچ گیا۔ مسٹر اسپیکر نے ہزاروں دفعہ "آرڈر۔ آرڈر اور خاموش خاموش" کہا مگر کون سنتا تھا آخر جب بائیں جانب کے لیڈر کھڑے ہوئے اس وقت کہیں جا کر ذرا امن ہُوا +

لیڈر - مسٹر اسپیکر جن واقعات کا اظہار ابھی معزز رکن مالیہ نے کیا ہے۔ ان کا لحاظ کرتے ہوئے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ پیش شدہ اسکیم کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے اور بذریعہ کمیٹی اس معاملہ کی دریافت کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ جو غلط فہمی اس وقت معزز اراکین پارلیمان کو پیدا ہو گئی ہے اس کو ہمارے معزز وزیر مالیہ اپنا بیان کمیٹی میں دے کر رفع کر دیں گے۔ اگر اس کارروائی کو ملتوی کرنے اور کمیٹی کے قائم کرنے کے متعلق ووٹ لئے جائیں تو مناسب ہے (آوازیں آئیں ہیر، ہیر)

مسٹر اسپیکر - میری بھی یہی رائے ہے۔ براہِ کرم وہ معزز اراکین جو اس کارروائی کو ملتوی کر کے بذریعہ کمیٹی اس معاملہ کی دریافت کرانے کے موافق ہوں وہ ہاتھ اٹھائیں۔

سوائے گورنمنٹ کے چند اراکین کے بقیہ سب نے ہاتھ اٹھا دیئے اور کارروائی ملتوی کی گئی۔ کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب ہُوا جس میں دادا جان بھی شریک کئے گئے۔ اور اس طرح ہمارے دادا جان کی شرکتِ اجلاسِ پارلیمان کا پہلا سیشن ختم ہُوا +

مرزا **فرحت اللہ بیگ**

دُنیا ساری کی ساری تمہاری ہے اب اور ہمیشہ کے لئے!

اور چونکہ تمہیں کسی شے کی ضرورت نہیں

اے میرے بادشاہ! تم اپنی دولت سے کچھ لُطف نہیں اُٹھاتے، گویا اُس کا ہونا نہ ہونا تمہارے لئے برابر ہے +

اس لئے مدتوں کے اندر آہستہ آہستہ تم مجھے دیتے رہتے ہو وہ سب کچھ جو تمہارا ہے اور مسلسل طور پر مجھ میں اپنی سلطنت قائم کئے جاتے ہو۔

روز بروز تم اپنی سورج کی روشنی میرے دل سے مول لیتے ہو اور میری زندگی کے مجسمے میں اپنی محبت کو تراشیدہ پاتے ہو

ٹیگور

وادیٔ امن

گودی میں پہاڑوں کی اِک وادیٔ دلکش ہے
قدرت کا کھلونا سا راحت کا بچھونا سا
گودی میں پہاڑوں کی
اِک امن کی دُنیا ہے یہ وادیٔ دلکش بھی
تہذیب کے پھندوں سے تادیب کے دھندوں سے
اقرار کی شورش سے انکار کی شورش سے
اظہار کی شورش سے ایثار کی شورش سے
ہر شور سے کوسوں دُور
گودی میں پہاڑوں کی یہ وادیٔ دلکش ہے

کیا حُسن کی دُنیا ہے اِک نقشۂ رعنائی!
سوئے ہوئے سبزے پر دھوئی ہوئی شبنم سے
ہر رنگ کی کلیاں ہیں اور پھُول ہیں یا ساغر
بکھرے ہوئے سایوں میں بکھری ہوئی کرنیں ہیں
بہتے ہوئے پانی میں اِک راگ سے دھیما سا
سُکھ چین درختوں کا چشموں کے کنارے پر

اک ناچ سا پھولوں کا جھونکوں کے اشارے پر
جب چاندنی راتوں میں چاند آ کے چمکتا ہے
کہسار کے سینے پر موتی سا دمکتا ہے

اِس وادیٔ دلکش کے چُپ چاپ سے جنگل میں
پھیلی ہیں چراگاہیں حاصل ہے جو کچھ چاہیں
پھولوں کی فراوانی پھل پات کی ارزانی
زوروں پہ ہے رنگینی جوبن پہ ہے شیرینی
آنسو ہیں نہ آہیں ہیں مسرور نگاہیں ہیں
پھل پھول بھی آہو بھی انساں بھی پکھیرو بھی
رہتے ہیں سبھی مل کر جنگل ہے خدا کا گھر
اُلفت کی وفا کا گھر راحت کی بقا کا گھر
چڑیاں ہیں رنگیلی سی پیاری سی رسیلی سی
پر دیکھو تو نیلی سی سر دیکھو تو پیلی سی
انسان سے آہو کو آہو سے پکھیرو کو
کھٹکا ہی نہیں مطلق
کھانے کا نہ پینے کا مرنے کا نہ جینے کا
جھگڑا ہی نہیں مطلق
آیا یہ مرے جی میں دُنیا سے نکل بھاگوں
کچھ دن تو وہاں چل کر دیکھوں کہ ہے کیا عالم

کچھ دن تو رہائی ہو کچھ دن تو ملے فرصت
دن رات کے کاموں سے چھوٹے بڑے ناموں سے
دُنیا کے سلاموں سے عُقبےٰ کے پیاموں سے
کچھ دن تو ہو چھُٹکارا

پَر جوڑ کے جب لیکن چاہا کہ میں اُڑ نکلوں
دیکھا تو میں قیدی تھا تقدیر کے پنجرے میں
بے پر تھا مرا بازو بے دِل تھا مرا پہلو
میں عقل کا قیدی تھا اِس نقل کا قیدی تھا
میں فہم کا بندہ تھا اِس وہم کا بندہ تھا
آواز مگر آئی اے خوشیوں کے شیدائی!
خوشیوں کی غلامی میں جو آپ کو کھوتا ہے
ہنسنے کی تمنا میں دن رات جو روتا ہے
دُکھ درد کی کُلفت میں سر کو جو پٹکتا ہے!
غیروں کی جو صُحبت میں بے سُود بھٹکتا ہے

آپ اپنا تو رہبر ہو اِس کوہ و بیاباں میں
اِس ظلمتِ گرداں میں اپنا ہو تُو آپ اختر
تُو غم کا مداوا بن تُو لُطف کا چشمہ بن
غم آئے تو غم سہہ کر خوش تر ہو دلِ مضطر
فطرت میں وہ قوت ہو خود زیست ہی راحت ہو
سمجھے جو حقیقت کو دُکھ سُکھ اُسے یکساں ہے

دل جس کے ہو سینے میں — مشکل اُسے آساں ہے
باراں مسرت میں — طوفانِ مصیبت میں
دل غرق ہے گر اُس کا — اُونچا ہی ہے سر اُس کا
اے امن کے سودائی — اے خوشیوں کے شیدائی
شورش گہِ دُنیا میں — کاوش گہِ دُنیا میں
دیکھے گا یونہی کب تک — خواب امن کی وادی کے
دوڑے گا یونہی کب تک — پیچھے غم و شادی کے
خود تجھ میں ترے دل میں — بزمِ غم و شادی ہے
خود تجھ میں ترے دل میں — اک امن کی وادی ہے
نزہت کا چمن ہے جو — خوبی کا وطن ہے جو
جو باغِ محبت ہے — جو خُلدِ مسرت ہے
غم بھی ہے جہاں شاداں — آزاد ہے اور رقصاں
اُس وادیٔ دلکش کی — خاموش فضاؤں میں
اُس جنتِ ارضی کی — مدہوش ہواؤں میں

اُڑتا ہُوا گائے جا
گا اور سُنائے جا

بشیر احمد

سکینہ

پروفیسر فیاض محمود پنجابی ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں پنجابی معاشرت کی جیتی جاگتی، دم لیتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں اگر کسی قوم کے ادب کا مقصد اُس کی زندگی کی روح پیش کرنا ہے تو اہلِ پنجاب کو لازم ہے کہ اپنے افسانوں میں یورپ اور صوبجاتِ متحدہ کی معاشرت کی ناکام نقالی سے احتراز کریں کوئی قوم کسی دوسری قوم کی زندگی کی سچی تصویریں پیش کرنے کے قابل نہیں ہے، یہ ہر قوم کا اپنا کام ہے۔ اگر اردو پنجاب کی زبان ہے تو پنجاب کو چاہئیے کہ اپنی حقیقی روح اردو ادب کی نذر کرے۔ یہ کام نہ صرف پنجاب کے لئے بلکہ ہندوستان کے لئے بھی مفید ہوگا۔ زیرِ بحث افسانوں میں پنجابی اندازِ بیان، پنجابی محاورہ، بلکہ بعض پنجابی الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ پنجابی معاشرت کی کامیاب مصوری کے لئے یہ ناگزیر ہے۔

اہلِ زبان "پنجابیت" پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اہلِ پنجاب شاید اس بات میں "اہلِ زبان" سے بھی دو قدم آگے ہیں حالانکہ اس کے بغیر پنجاب میں حقیقی ادب پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ "پنجابیت" کی ملونی کے بغیر پنجاب میں اردو کی نشوونما ہی محال ہے۔ جب مشرق و مغرب کی تقریباً ہر زبان کے الفاظ و محاورات اردو میں قابلِ قبول ہیں تو کیا پنجابی زبان محض اس لئے اردو کے لئے باعثِ ننگ ہے کہ اساسی طور پر یہ اردو سے قریب ترین مناسبت رکھتی ہے۔ اگر پنجاب کی اردو "پنجابیت" سے بارہ پتھر باہر رہی تو پنجاب کا ادب اصلیت سے کوسوں دور رہے گا، اور اس کے دھندلے بے جان مرقعے دنیا کے ادب میں کوئی حیثیت نہ رکھیں گے پنجابی اندازِ بیان سے یکسر روگرداں ہو کر پنجاب کوئی حقیقی ادب پیدا نہیں کر سکتا، اور نہ اردو پنجاب کی زبان رہ سکتی ہے۔

حامد علی خاں

کریم اُس دن صبح صبح اٹھا۔ مارچ کا اخیر تھا۔ ان کے غریبانہ سے گھر میں بھی گھاس اور نئے پتوں کی بُو سے بسے ہوئے ہوا کے خوشگوار جھونکے ٹھہر ٹھہر کے آ رہے تھے۔ کریم نے نہا کے کپڑے بدلے۔ شاید جمعہ تھا اپنی بڑھیا ماں سے کہا "بی بی" (وہ اپنی ماں کو اپنے مرحوم ماموں کی طرح بچپن سے بی بی ہی کہا کرتا تھا) "مجھے جلدی جلدی ایک روٹی ڈال دو۔ اگر شکر ہو تو تھوڑی سی دے دینا۔ مجھے آج جلدی جانا ہے وہ ہے نا نیا مکان بابو رحیم بخش کا، اس کا کام میرے ہی سپرد ہے۔"

ماں نے تھوڑا سا آٹا گوندھ رکھا تھا اور آگ جلا رہی تھی۔ رات کو کہیں چولہا ننگا رہ گیا تھا اس لئے اوس سے بھیگ گیا تھا۔ رات کی آدھی جلی ہوئی لکڑی بھی کچھ کچھ گیلی سی تھی۔ اس لئے بیچاری پھکنی سے ہوا تو دے رہی تھی مگر دھوئیں کے سوا اور کچھ بنتا نہیں تھا۔ کریم ایک ساعت تک تو دیکھا کیا پھر چولھے پاس جا ماں سے پھکنی لے لی اور ایک جوان سانسوں سے پُر زور پھونک ماری۔ آگ جل اٹھی۔ ماں نے بھیگی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے کچھ فخریہ خوشی سے کہا "نہ بیٹا تو نہ کپڑے خراب کر" "اٹھ جا چارپائی پر بیٹھ۔ میں ابھی تیری روٹی لاتی ہوں"۔ روٹی کھا کے وہ اندر سے اپنی تھاپی اور ولبسولی نکال لایا اور ماں کو سلام کر کے کام کو چل دیا۔

کریم تیرہ برس کا تھا جب اس کا باپ انتقال کر گیا تھا۔ وہ اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ماں کے پاس تھوڑا سا اندوختہ اور کچھ گہنا تھا۔ کچھ عرصہ تو کریم کو پڑھاتی رہی مگر دو سال کے بعد بالکل استطاعت نہ پا کر ناچار سکول سے اٹھوا لیا اور اُس کے باپ کے کام میں لگا دیا۔ اب وہ دونوں اپنے چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو شہر کے جنوب مشرقی گوشے میں تھا محلہ کو امل محلہ کہتے تھے۔ شاید کبھی یہاں دو ایک املی کے پیڑ ہوں گے۔ محلہ کے اکثر مکان یک منزلے اور مختصر سے تھے۔ گلیاں پیچ در پیچ اور تنگ تھیں۔ اکثر گلیوں کی نالیاں عین درمیان سے گزرتی تھیں کئی دفعہ آتے جاتے لوگوں کے بازو یا کاندھے ایک دوسرے سے بھڑ جاتے تھے۔ اور یہ تو روزمرہ کی بات تھی کہ گلیوں میں چونکہ موڑ

بہت تھے اور بعض موڑ دائیں بائیں فوراً ہی گھوم جاتے تھے اس لئے جلدی سے موڑ مڑنے والے اشخاص ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔ مکانات اکثر چکنی مٹی سے لپے ہوئے تھے اور اجنبیوں کے لئے اگر کوئی شناخت کی صورت ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ بعض گھروں پر بالاخانے بھی تھے اور بعض کی دیواروں پر یا کہیں کونے پر کسی مٹکے کے پیندے یا مٹی کی بڑی ہنڈیا میں ناز بو یا گلو، یا موتیا کے پودے لگے ہوئے تھے +

کریم اپنے گھر سے نکل، دو ایک مکان گزر، بائیں طرف کو گھوما۔ گلی میں کیچڑ تھی۔ اس لئے بیچ بیچ کے چلتا تھا۔ دوسری گلی کچھ صاف تھی اور نالی کے دائیں طرف کا رستہ قدرے چوڑا تھا، وہ اسی پر ہو لیا۔ اس کے دائیں ہاتھ کے گھروں کے دروازے کھلے تھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے صحن نظر آسکتے تھے۔ کریم ایک معمار ہونے کے باوجود اپنے تئیں معماروں، بڑھیوں، اور کسانوں سے الگ سمجھا کرتا تھا۔ کچھ تعلیم کا اثر، کچھ ماں کی تربیت کا اثر، کچھ غربت، کچھ اپنی فطرت، جس نے اُسے خوبصورت چیزوں سے انس رکھنا سکھایا تھا۔ محلے کے اکثر لوگ مزدور یا بڑھئی وغیرہ تھے اس لئے کوئی خاص پردہ نہیں کرتے تھے مگر کریم ایسی سادہ طبیعت کا مالک تھا کہ اس نے کبھی کوشش سے لوگوں کے گھروں کے اندر جھانکا نہ تھا۔ کچھ لوگ شہر سے باہر کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔ گاؤں میں عام طور پر بھی ہر شخص اپنے کام میں ایسا مصروف نظر آتا تھا کہ کسی کو نہ فرصت تھی نہ تجسّس کہ ٹھہر کر گھروں میں جھانکتا پھرے۔ کریم تو بجز اپنی خاص گلی کی مُسن عورتوں کے جن میں وہ پیدا ہوا، کھیلا اور بڑھا اور چند ہم سن لڑکیوں کے جن کے ساتھ وہ بچپنے میں کھیلا کرتا تھا اور جو تقریباً سب بیاہی جا چکی تھیں کسی غیر عورت سے کبھی ہم کلام بھی نہ ہوا تھا۔ اگرچہ اب وہ اکیس سال کا ایک خوش شکل، جوان اور تندرست لڑکا تھا مگر اتنا شرمیلا کہ گلی میں اگر کہیں دو تین عورتیں راستے میں کھڑی باتیں کر رہی ہوتیں تو وہ گلی چھوڑ دیتا +

ایسے ہی بائیں ہاتھ میں تھاپی اور کسولی پکڑے نیچی نظر کئے جا رہا تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے ایک موتیا کا پھول آتا آتا رہ گیا +

کریم کو موتیا بہت پسند تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو ان کے اپنے گھر میں دو موتیا کے پودے ہوا کرتے تھے اور اس کی ماں صبح اٹھ کر موسم بہار میں جب پھولوں کو توڑتی تو دو ایک پھول ضرور کریم کو دیا کرتی تھی۔ اب اگرچہ نہ وہ پودے ہی تھے نہ پھول مگر کریم کو موتیا سے وہی انس تھا +

اُس نے وہ پھول اٹھا لیا۔ سوچا یہ کیسے یہاں آیا۔ یونہی اوپر نظر اٹھائی تو دیوار پر ایک گھڑے کے پیندے میں اسے موتیے کا پھولوں سے لدا ہوا پودا دکھائی دیا۔ ابھی اس کی نظر وہاں سے ہٹی نہ تھی کہ اسے ایک گندمی ہاتھ پھول توڑتا دکھائی دیا۔ اس نے نظر ہٹا لی۔ پھول کو سونگھتا ہوا آگے بڑھا تو بے اختیار اور غیر شعوری طور پر نگاہ دائیں طرف پھر کر کھلے ہوئے دروازے سے اندر گزر گئی اور چونکہ دروازے کے ساتھ ہی گلی پھر دائیں جانب کو مڑ جاتی تھی اس لئے اُسے اس چھوٹے سے صحن کا کافی حصہ نظر آگیا۔ اور ساتھ ہی پھول توڑنے والی کی ایک جھلک +

لڑکی اُسی طرح کھڑی پھول توڑ رہی تھی نہ تو اسے معلوم تھا کہ پھول نیچے گر پڑا ہے اور نہ یہ کہ کسی نے اُٹھا لیا ہے اور وُہ ایک چھلکتی ہوئی نظر ان کے صحن میں ڈال گزر رہا ہے۔ جو کچھ کریم نے دیکھا وہ ایک جوان لڑکی کے کالے بال اور کالی اور بھری ہوئی چوٹی تھی جو اس کے سفید سادہ سے دوپٹے کے نیچے سے بھی جھلک رہی تھی اور اس کی کمر کا خم تھا جو اس جیسے انجان کی سرسری نگاہ سے بھی نہ چھپ سکا۔ اس کا جسم خوبصورت اور قد خوب کھنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کریم گزر گیا۔ اتنی جلدی، کہ اور کچھ نہ دیکھا۔ دیکھا تو فقط دوپٹا جو

سر سے ذرا ڈھلک گیا تھا مگر اُس نے اِس موتیا کے پھول کو اور احتیاط سے پکڑ لیا اور بغور اسے دس ایک قدم تک دیکھا کیا +

معاً اسے خیال آیا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ اس نے اِدھر، اُدھر چاروں طرف دیکھا۔ اتفاق سے اور سویرا ہونے کی وجہ سے کوئی اس جگہ موجود نہ تھا۔ اُس کے دل کو تسلی ہوئی۔ سوچنے لگا کہ یہ لڑکی کون ہے، کس کا گھر ہے، شاید کسی گوجر کا ہوگا، مگر وہ لڑکی تو گوجروں کی لڑکی نہیں معلوم ہوتی، وہ تو ذرا اچھے گھر کی لڑکی دکھائی دیتی ہے جیسے مثلاً ان شیخ صاحب کے گھر کی ہو جنہوں نے ابھی مہینہ ہُوا ہی صحن میں فرش کرایا تھا، مگر نہیں تو کپڑے تو سادہ ہی تھے۔ چوٹی کیسی خوبصورت تھی اور لمبے لمبے بال، اس کی کمر پر پڑی ہوئی چوٹی کیسی اچھی لگتی تھی۔ وہ گلیاں مُڑ تا گیا اور یہ خیالات بہت سرعت سی آتے گئے اور مٹتے گئے۔ پھر یک دم شرما گیا کہ کسی لڑکی کے متعلق وہ یوں بیباکانہ اور شوق سے سوچ رہا ہے +

اس کے کرتے کی جیب پہلو میں تھی، خیال کیا کہ پھُول کو کیا کیا جائے، پھول موتیا کا تھا، موتیا اِسے بے انتہا پسند تھا، موتیا کا پھول اتنا اچھا پھول کیا وہ پھینک دے؟ اور پھر ایسی اچھی خوشبو، ایسی نازک پنکھڑیاں اِتنی گول سی لُٹی، اسے پھینک دے؟ نہیں۔ تو پھر اسے رکھے کہاں؟ جیب میں تو ہے چابی اور وہ بھی بھدی سی ہیلی، دیسی تالے کی۔ تو کیا پگڑی میں؟ مگر کہاں؟ شملہ میں؟ یا اوپر یا کہیں پیچوں میں؟ اوہ! قمیص کے نیچے صدری جو ہے، اس کی جیب میں اور کچھ ہے بھی نہیں اور پھول محفوظ بھی رہے گا۔ اس لئے کریم نے نہایت احتیاط سے اِس موتیا کے پھول کو، جس کی خوشبو اسے اتنی پسند تھی، جس کا رنگ اسے اتنا پسند تھا، اتنا پیارا لگتا تھا، اس پھول کو نہایت احتیاط سے دائیں بائیں دیکھ کر اپنی صدری کی جیب میں رکھ لیا +

دوپہر کے بارہ بج گئے۔ بابو رحیم بخش کے مکان پر دو معمار اور بھی کام کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے گئے۔ اس وقت کھانے کے لئے چھٹی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک بوڑھا مستری بھی کام کر رہا تھا۔ وہ بار بار ایک جوان، خوش شکل سے مستری کی طرف دیکھتا جو اپنے کام میں مشغول اینٹوں پر اینٹیں جڑ رہا تھا۔ تیسرے راج نے دو اینٹیں اور لگا کر ہاتھ روک لیا اور بوڑھے راج سے کہا "کیوں بھئی بھوک نہیں لگی"۔ اس نے کہا "میاں کریم آج جمعہ ہے"۔ کریم نے جواب دیا "اوہو آج تو واقعی جمعہ ہے۔ لے لو، یہ بس ہے اور آخری اینٹ اپنے کونے میں جڑ، اوزار صاف کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بوڑھا مستری تو وہیں حقہ کھینچ کش لینے لگا مگر باقی دونوں معمار، کریم اور دوسرا کپڑے جھاڑتے ہوئے پاڑ سے اُترنے لگے +

کریم سیدھا گھر کو ہو لیا۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنے محلے سے گزر رہا تھا کہ ایک موڑ پر اسے دُور سے تین چار عورتیں کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ اسے بڑی گھبراہٹ ہوئی اس امر سے اور بھی کہ یہ وہی موڑ تھا جس کے پاس اسے وہ پھول صبح کو پڑا ملا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھ کے سینہ تک آیا اور اُس نے صدری کو ٹٹولا۔ ٹھیک، پھول تو وہیں تھا۔ مگر اس جگہ سے گزر کیسے جائے وہ تو بیچ راستے میں کھڑی ہیں۔ انہیں کیسے کہا جائے کہ راستہ دے دو۔ یہ تو جس جگہ کھڑی ہو جائیں ہٹا ہی نہیں کرتیں۔ مگر اب وہ اُس مکان کو کیسے دیکھ سکے گا۔ اب وہ لڑکی کیسے نظر آئے گی۔ اب تو دوسرا راستہ بھی پیچھے رہ گیا۔ اور یہ لو انہوں نے دیکھ بھی لیا، شاید وہ بھی اُنہیں میں کھڑی ہے۔ وہ تو شاید باتیں بھی اسی کے متعلق کرنے لگ گئی ہیں۔ اُس نے جلدی سے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی، کپڑے تو میلے نہیں ہیں۔ آج ہی تو بدلے تھے، پگڑی بھی صبح ہی باندھی تھی۔ اب تو بالکل دس قدم رہ گئے۔ اب نظر کیسے اُٹھے گی۔ اب دیکھا کدھر جائے گا۔ یہ گلی سیدھی بھی جاتی ہے مگر سامنے تو محلہ کی مسجد ہے۔ اوہو! جمعہ بھی

آکر پڑھنا ہے۔ بہت دن ہوئے نماز بھی نہیں پڑھی، کتنی بُری بات ہے، بی بی روز ہی تو کہتی ہے کہ بیٹا اب تُو نماز چھوڑتا جاتا ہے نہیں نماز ضرور پڑھنی چاہیئے، ابھی واپس آتا ہوں اب سے باقاعدہ پڑھا کروں گا۔ مسجد بھی تو پاس ہی ہے بلکہ راستے ہی میں ہے، کیسی اچھی بات ہے۔ باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کروں گا۔ ان نیک ارادوں سے دل کو مضبوط کر کے کریم اس جگہ سے گزر تو گیا مگر اس کا منہ سُرخ ہو رہا تھا۔

بیس منٹ کے بعد کریم کھانا کھا کے مسجد کو آیا۔ دل میں ارادہ تھا کہ خواہ کچھ ہو اب ضرور کوشش کروں گا اسے دیکھنے کی + دروازہ تو اُن کا کھُلا ہی رہتا ہے اور شاید اب وہ عورتیں وہاں ہوں گی بھی نہیں۔ کریم جب اس مکان کے نزدیک آیا تو دیکھا کہ واقعی اب جگہ صاف ہے۔ پہلے تو اُس نے گردو پیش دیکھا اور پھر ادپر، تمام جگہ سنسان تھی جیسے کوئی بستا ہی نہیں مسجد کی طرف مُڑنے لگا تو اُس کمال تہور سے اُس گھر پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ مگر وہاں اسے کوئی فرد بشر دکھائی نہ دیا۔ اسے بہت مایوسی ہوئی۔ ساری نماز کا مزا کرکرا ہو گیا مگر وہ جلدی جلدی نماز ختم کر کے سب سے اول مسجد سے نکلا کہ اب تو دروازہ بالکل سامنے ہوگا، اب تو مڑنا نہیں پڑے گا۔ اب تو اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل ہی جائے گا۔ وہ جلدی جلدی آ رہا تھا کہ عین موڑ پر اُسے ایک لڑکی دائیں طرف کے کسی گھر سے نکلتی ہوئی ملی۔ بس کریم کا اور اس کا ایک بالشت کا فرق ہی رہا ہوگا کہ کریم رُک گیا ورنہ دونوں آپس میں ٹکرا جاتے۔ کریم گھبرا سا گیا۔ اتنی عمر میں کسی اجنبی لڑکی سے اسے اتنا قرب کبھی حاصل نہ ہُوا تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا، وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا لڑکی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور وہ آنکھیں اتنی جاذب تھیں کہ جب تک وہ کریم کو دیکھا کیں وہ وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ اسے بعد میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ آنکھیں بھوری تھیں کہ کالی۔ ان کی چمک ہی ایسی تھی کہ وہ اور کچھ دیکھ ہی نہ سکا۔ کوئی خط و خال پہچان نہ سکا اور یہ سب کچھ دو لمحوں میں ختم بھی ہو گیا۔ وُہ لڑکی اُسی گھر میں داخل ہو گئی اور جب کریم نے اُس کی پشت کو دیکھا تو اسے وہی لمبی سیاہ چوٹی، وہی کمر کا خم نظر آیا۔ اُس نے پہچان لیا کہ یہ وہی پھول والی لڑکی ہے +

بعد میں اسے یاد آیا کہ اس کا رنگ نکھرا ہُوا گندمی تھا، ننھے نازک اور خوش ساخت تھے۔ جسم گدرایا ہُوا تھا۔ کپڑے بالکل سادہ تھے اور وہ ننگے پاؤں تھی۔ شام کو جب کام سے واپس آیا تو دل میں دعائیں مانگتا آیا کہ ایک دفعہ اور نظر آ جائے مگر سوائے دیواروں اور موتیا کے پودے کے اسے کچھ نظر نہ آیا البتہ ان کے گھر سے دھوآں ضرور اٹھ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے اس شام مغرب کی نماز باجماعت ادا کی مگر اس عبادت سے اسے کوئی خوشی نصیب نہ ہوئی اور نہ رات کو بستر پر لیٹتے وقت اسے پہلے جیسی بے فکری اور سکون ہی حاصل تھا +

رات کو دیر تک سوچتا رہا کہ یہ ہیں کون لوگ، زمیندار تو لگتے نہیں، زمینداروں اور ان کی لڑکیوں کو کیا کبھی دیکھا نہیں؟ کچھ بھی ایک دوسری میں فرق نہیں ہوتا، سب کی سب بھاری، بھرکم ہوتی ہیں موٹی موٹی چادریں لئے ہوئے تنگ پائنچے کی شلواریں اف! مگر یہ لڑکی تو بہت ستھری اور خوش وضع تھی۔ اور آنکھیں تھیں کہ غضب! مگر بھلا اس کا نام کیا ہوگا؟ یہ کیسے معلوم ہو؟ نام تو ضرور ہی اچھا ہوگا یہ نہیں کہ غلام فاطمہ، زینبے ریشم بی بی اور جانے کیا کیا۔ یہ بھی کیا نام ہوئے؟ مگر اس محلے میں تو اور کوئی بڑے لوگ رہتے

ہی نہیں اور پاؤں بھی تو ننگے تھے۔ تو ہُوا کیا بھدے بھی تو نہیں تھے۔ بہت ہی تو اچھے تھے، اور جسم کتنا سیدھا تھا اور کمر میں لچک کتنی تھی جب وہ دروازے میں داخل ہو رہی تھی تو بایاں پاؤں پہلے اندر رکھا تھا اس وقت کمر کا خم کتنا خوبصورت ہو گیا تھا کتنا ہی اچھا لگتا تھا؛ بھلا اُس کی عمر کیا ہو گی، مجھ سے تو بہت چھوٹی ہو گی، یہی کوئی سترہ سال کی ہو گی، مگر اس کا باپ کون ہے؟ اور یہ آئی کہاں سے ہے؟ پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اگر یہیں رہتی تھی تو کتنا اندھا تھا میں کہ کبھی دیکھا ہی نہیں۔ آخر اللہ نے آنکھیں دی ہیں تو کیوں نہیں دیکھا۔ اللہ نے خوبصورتی بھی کسی کام کے لئے پیدا کی ہے، مثلاً یہ پھول ہیں یہ موتیا ہی لے لو، اور وہ موتیا، وہ پھول کہاں گیا، ...... صدری میں ...... صدری تو وہ پہنے ہُوئے ہے ...... یہ ہے نا وہ پھول ...... کہیں پس نہ جائے ...... نہیں تو ...... اچھا اب صبح ہی سہی ...... صبح کو ......

صبح ہوئی تو کریم حسبِ معمول جلد ہی تیار ہو گیا۔ ماں نے تھوڑا بہت ناشتہ دیا۔ روٹی کے دو ایک لقمے کئے، جلدی سے فارغ ہو کر، اوزار لے کام کو روانہ ہو گیا، مگر جوں ہی دوسرا موڑ مڑا اُس کے قدم سُست ہوتے گئے اور جب وہ اس مکان کے قریب پہنچا تو اور بھی آہستہ چلنے لگا، موتیا کے پودے کو دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا، مگر جب دروازے سے اندر جھانکا اور وہ بھی دھڑکتے ہوئے دل سے تو اسے ایک معمر شخص چارپائی پر حقہ پیتا نظر پڑا اور اُس کے پاس ایک عورت، کوئی اور ہی، مگر اس لڑکی کا نام نہ نشان! اس نے فوراً ہی نظر ہٹا لی کہ کہیں کوئی یا ان دونوں میں سے کوئی نہ دیکھ لے۔ کام پر پہنچ گیا مگر ایک ایک اینٹ آج دگنے وزن کی محسوس ہو رہی تھی اور پھر اینٹیں جڑنے میں اس جیسے کاریگر نے جو باوجود نوعمر ہونے کے ابھی سے بڑے بڑے کاریگروں جتنی اجرت لیتا تھا، کئی ہی دفعہ تو بھول کی خیال کہیں تھا، جھنجھلاتا کہ آخر ہُوا کیا۔ یہ بھی کیا لغویت ہے کہ ایک دفعہ دیکھا ہے اور اُس کا خیال جنون بن کر دماغ پر سوار ہے اور وہ جانتی بھی نہیں، پھر خیال آتا کہ اگر اسے معلوم نہیں تو ضرورت ہی کیا ہے، نہ معلوم ہو۔ وہ خود تو اسے دیکھ ہی لیا کرے گا۔ ظہر کے وقت سہی، آج عصر کے وقت ہی سہی۔ کام بھی نہ چھوڑنا پڑے، آخر عصر کی نماز بھی تو پڑھنی ہوتی ہے اور یہ بھی کیا اچھی بات ہے کہ مسجد بھی بالکل نزدیک ہی ہے اور یہ بھی کتنی خوش قسمتی ہے کہ کام بھی نزدیک ہی ملا ہُوا ہے۔ کوئی دو ایک مہینے تو رہے گا، مکان بڑا ہے؛ پھر مغرب کا وقت ہے، تو نام کیا ہُوا اس کا، یہ اینٹ بھی کس قدر خراب ہے، دیکھ کے نہیں لاتے کم بخت! (مزدور سے) او غلام محمد یہ اینٹیں دیکھ کے لایا ہے، یہ دیکھ بالکل ہی کچی ہے اور سوکھی اور یہ بالکل ہی جلی ہوئی پتھر کی پتھر! ......

بے ربط سے خیالات اُس کے دل میں آتے اور گزر جاتے مگر اسے قرار نہیں تھا یہی سوچتا کہ اب چھٹی ہو تو پھر ادھر سے گزروں، اب تو دیکھ ہی لوں گا، وہ جو بوڑھا تھا اس کا باپ ہے؟ کون ہے؟ یہ آدمی کبھی دیکھا نہیں، شاید کبھی دیکھا ہو، نام کیا ہو گا؟ اور کام کیا کرتا ہے؟ اب میں پوچھوں کس سے، پھر خیال آتا کہ پہلے اسے دیکھا تو جائے، ابھی تو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں مگر جسم کس قدر خوبصورت ہی کتنا پیارا ہے ......

دوپہر کو جب اس گھر کے نزدیک پہنچا تو اسے ایک چال سُوجھی، اچانک ـــــ، عین ان کے دروازے کے سامنے جھکا، اپنا جوتا اتار کر اسے جھاڑا، اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا کہ صاف ہے یا کوئی کنکر وغیرہ ہے اور پھر پاؤں ہاتھ سے صاف کر کے جوتا پہنے

لگا۔ جس وقت پاؤں جھاڑ رہا تھا اس نے مکان کی طرف نظر پھرائی، اُس کا جوتا وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اندر سے وہی لڑکی نہایت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی نظر میں پہچان تھی۔ کریم کا یہ حال ہوا گویا کسی نے کوئی جرم کرتے اسے پکڑ لیا ہو، جوتی گھسیٹ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ حالت یہ تھی کہ پسینہ چھوٹ گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگ گیا۔ بغیر پیچھے دیکھنے کے سیدھا گھر پہنچا۔ اُس دن اسے جرأت نہ ہوئی کہ نماز کے لئے مسجد میں جائے۔ دوسرے رستے سے کام پر پہنچا اور شام کو جب دل کو بہت سی ڈھارس دے کر اسی راستے سے گھر پہنچا تو اسے راستے میں کوئی نہ ملا۔ مگر کب تک! دوسرے دن جب پھر ادھر سے گزر ہوا تو مونیا کے بوٹے کو بھی دیکھنا پڑا اور وہاں وہی لڑکی کھڑی تھی اور اس دفعہ تو نیچے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ شرما تو گیا مگر اتنا نہیں کہ بھاگ کھڑا ہو۔ چار قدم پر اسے وہ موڑ مڑنا تھا۔ اب کی بھی اُس نے مکان کے اندر نظر ڈالی اور دیکھا کہ چارپائی گھسیٹ کر دیوار کے قریب کی گئی ہے اور لڑکی اس پر کھڑی ہے۔ مگر گردن پھرا کر دروازے کی طرف یعنی اس کی طرف بھی دیکھ رہی ہے۔ کریم کو گھبراہٹ تو ہوئی مگر خوشی سے ملی ہوئی کہ اب تو اُس نے بھی دیکھ لیا ہی اور خود میں نے بھی اسے اچھی طرح دیکھ لیا ہی اور اب تو ایک ایک نقش یاد ہو گیا ہی۔ جی چاہا کہ ایک دفعہ بس ایک دفعہ ایک منٹ کے لئے یونہی کسی بہانے سے پھر ادھر سے گزرے دم بھر کے لئے رکا بھی مگر جرأت نہ پڑی۔ برابر چلتا گیا اور کام پر پہنچ گیا +

بس پھر تو معمول ہو گیا۔ صبح کو، دوپہر کو، شام کو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔ صبح تو مونیا کے بوٹے کے پاس جس کی بدولت دو ایک دن بعد کریم کو روزانہ ایک پھول وہاں سے ملنے بھی لگ گیا۔ یعنی اتفاقیہ! جب وہ مکان کے قریب پہنچتا تو ایک آدھ پھول ضرور اوپر سے آ گرتا اور جب کوئی گلی میں نہ ہوتا تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیتے۔ اچھی طرح سے۔ شوق سے۔ اور دوپہر کو دروازے پر یا موڑ پر یا گھر کے اندر سے ان کی آنکھیں ضرور دوچار ہو جاتیں۔ البتہ شام کو کبھی اتفاق ہوتا اور کبھی نہیں۔ اور جب کریم کو کام سے آتے دیکھنے کا موقع نہ ملتا تو وہ ضرور نماز مسجد میں باجماعت پڑھتا اور سب سے اول فارغ ہو کر واپس چلا آتا۔ اکثر ایسا اتفاق ہو جاتا کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ٹکراتے بچ جاتے +

ماں بہت خوش ہوتی کہ کریم نمازی ہوتا جاتا ہے اور کام پر بھی بہت باقاعدہ جاتا ہے، مگر کبھی کبھی صبح اور دوپہر کے وقت کریم کے جلدی جلدی کھانا کھانے سے جھنجھلاتی بھی مگر کریم یہی کہتا کہ کام بہت ہے، جلدی جانا ہے، نماز پڑھنی ہے اور کبھی وہ دو ایک لقمے آہستہ آہستہ منہ میں ڈال کر، پھر جلدی شروع کر دیتا، مگر وہ کیا سمجھتی کہ اسے آج کل کیوں اس قدر جلدی کی عادت ہو گئی ہے۔ ہفتے کے ہفتے کریم کو ساڑھے سترہ روپے اڑھائی روپے روزانہ کے حساب سے ملتے جو وہ پورے کے پورے اپنی ماں کو دے دیتا۔ اس لئے بھی ماں کو یہ خیال نہ آتا کہ کریم اب کیوں گھر میں نہیں ٹھہرتا۔ جب کبھی جمعہ کو دو ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی تو کریم بس ایک پل کے لئے ہی گھر آتا، دو ایک نوالے منہ میں ڈال یہ جا وہ جا، یا کبھی نماز ہو جاتی، یا کسی نئے مولوی کا وعظ یا کوئی جلسہ۔ ماں کو اس پر بھی حیرانی نہ ہوتی کہ کریم اب کیوں اکثر ایک آدھ اوزار صبح بھول جاتا ہے، حالانکہ اوزار سب ایک ہی جگہ پڑے ہوتے ہیں اور پھر نصف راستے سے واپس آ کر لے جاتا ہے +

ادھر کریم بیچارے کا دماغ سوچتے رہنے میں بہت خرچ ہوتا۔ ہر وقت کام پر ہو یا فارغ سوتے وقت یا نماز پڑھتے وقت یہی فکر

ہوتا کہ اس سے بات کس طرح کی جائے، اس کا نام کس طرح پوچھا جائے۔ اب پندرہ روز گزر گئے ہیں، کئی دفعہ بہت نزدیک سے بھی دیکھا ہے۔ مانا کہ ہر روز ایک آدھ دفعہ، اکثر دو چار مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ لینے کا موقع مل جاتا ہے مگر ایک دوسرے کے ناموں کا بھی تو پتا نہیں۔ کرے تو کیا کرے، ماں سے پوچھے؟ کیا پوچھے؟ کہ مجھے ایک لڑکی کا نام بتا دے، یا یہ کہ فلاں لڑکی کا باپ کیا کام کرتا ہے؟ مسجد میں وہ ڈھونڈتا کہ شاید کہیں وہ بوڑھا جو اس کے گھر میں دیکھا تھا نظر آجائے۔ تو کسی سے پوچھا جائے، یوں دوست بھی ہیں، ایک دو تو بہت گہرے دوست ہیں، ان سے بھی کیا پوچھتا پھرے۔ اور پھر وہ رہتے بھی تو محلے کے دوسرے کنارے پر ہیں اور اپنے اپنے کام پر رہتے ہیں۔ . . . .

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اپنی ماں کے علاوہ کسی اور عورت سے اُسے دلچسپی ہوئی اور دلچسپی بھی ایسی کہ اُس کے سان گمان میں بھی نہ کبھی آئی تھی۔ ہر گھڑی، ہر پل، ہر لمحہ اسی دھیان میں کہ آج اُس نے بادامی دوپٹہ پہنا تھا، بادامی رنگ بھی کتنا خوشنما رنگ ہے، آج اُس کے ہونٹ کیوں اتنے سُرخ تھے؟ دوپہر کا وقت تھا اور وہ دھوپ میں کھڑی تھی مگر اتنے سُرخ ہونٹ! اتنے سُرخ، سانس رُک جاتی تھی خیال کرتے کرتے۔ اور پھر جب وہ مسکرائی تھی تو اُس کے دانت کیا یک لخت چمک اُٹھے تھے، اتنے چمکیلے بھی کسی کے دانت ہو سکتے ہیں! یا آج اُس نے فیروزی پھولوں والی چھینٹ کی شلوار پہن رکھی تھی، فیروزی بھی کتنا اچھا رنگ ہے کبھی خیال ہی نہیں آیا اور وہ پھول کتنے خوبصورت تھے اور شلوار اس کی کمر میں کتنی ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ آج شاید دوپہر کو گرمی زیادہ تھی، اُس کے گریباں کا بٹن کھلا ہوا تھا، توبہ، توبہ کتنی سفید گردن ہے! اتنی سفید! اتنی سفید بھی کوئی گردن ہو سکتی ہے..... ایسے چمک رہی تھی جیسے سیپ کی بنی ہوئی ہو . . . . .

بس سارا دن اسی ادھیڑ بُن میں گزر جاتا۔ روز کریم اپنے آپ سے عہد کرتا کہ آج شام کو اگر وہ نماز سے آتے وقت مل گئی تو اُس کا نام ضرور پوچھ لوں گا۔ مگر جب موقع ملتا تو اسے ایسی چپ لگتی کہ کچھ بن نہ آتا۔ اس کی تمام رُوح کھنچ کے اس کی آنکھوں میں آجاتی، اپنے جذبات کی تمام کوشش اور قوت سے اسے دیکھتا، سر سے پاؤں تک دیکھتا، ٹھہر بھی جاتا، بھول بھی جاتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے کہ نہیں، مگر منہ سے یہ نہ نکلتا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ روز اپنے آپ کو کوستا کہ آج تو ذرا ایک سیکنڈ کے لئے وہ بھی ٹھہر گئی تھی، یونہی ایک لمحے کے لئے، بس آنکھ کے پلکارے کے لئے اس وقت ذرا آہستہ سے اگر پوچھ لیتا کہ تمہارا نام کیا ہے تو کیا حرج ہوتا۔ وہ تو ضرور ہی بتا دیتی یا شاید نہ بتاتی۔ نہیں تو ضرور ہی بتا دیتی۔ اب تو شاید اسے بھی ذرا سا خیال ہو گیا ہوگا کہ میں کیوں اُس کی طرف دیکھتا ہوں، مگر نہیں جی! اسے کیا خیال ہو سکتا ہے۔ یہ تو اتفاق ہو جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مل پڑتے ہیں مگر دو تین دفعہ اس نے میری طرف دیکھ کے پھول تو پھینکا ہے! تو اس میں کیا بات ہو گئی، یونہی پھینک دیا یا ہاتھ ہی سے گر پڑا ہوگا . . . . . . یہی جواب و سوال دل میں ہوتے رہتے۔

نماز پڑھ کے وہ دعائیں مانگتا: یا اللہ مجھے اس کے گھر والوں کا پتا لگ جائے، یا اللہ اس کا نام معلوم ہو جائے۔ یا اللہ مجھے کہیں سے روپیہ مل جائے، یا اللہ مجھے تو امیر کر دے، یا اللہ مجھے تو اس کی بہت سی محبت دے دے۔ مگر ایک دن اچانک اس نے بہت خشوع سے یہ دعا مانگی یا اللہ تو اس کے دل میں میری محبت ڈال دے، اور پھر اسی دن سے اسے ایک ذوق سا ہو گیا کہ ہاں مجھے وہ چاہنے لگ جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ مجھے وہ پیار کرنے لگے تو کیا حرج ہوگا اس کا۔ نماز کے بعد بہت خلوص سے دعا مانگتا، کبھی سجدہ میں گر کے کبھی مسجد

کے کسی کونے میں سب سے علحدہ ہوکر کہ کوئی سُن نہ لے، کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے۔ بہت لجاجت سے وہ دعائیں مانگتا کہ یا اللہ اسے میری محبت دے، یا اللہ اِس کے دل میں میری محبت ڈال دے، یا اللہ مجھے وہ بہت پیار کرنے لگ جائے، یا اللہ مجھے وہ ہر وقت یاد کرتی رہے: جیسے میں کرتا رہتا ہوں ....

جب دعا مانگ کے آتا تو کے اسے بہت متجسس نظروں سے دیکھتا کہ شاید دعا قبول ہوگئی ہو، یہ خیال نہ آتا کہ اگر ہو جائے تو اسے کیسے پتا چلے گا، مگر اسے یقین ہوتا کہ اگر اسے بھی میرے جیسی محبت ہو تو ضرور معلوم ہو جائے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ معلوم نہ ہو۔ پھر سوچتا کہ نہ سہی پتا چلے مگر اسے محبت ہو تو جائے نا۔ یہ تو نہ ہو کہ میں تو سارا دن اُس کے خیال میں ڈوبا رہوں اور اسے معلوم بھی نہ ہو پھر کہتا کہ اچھا نہ بھی معلوم ہو تو کیا ہے۔ مجھے تو ہے نا۔ اس کا ذمہ تو میں نے نہیں لیا، اسے نہ معلوم ہو اور اسے ہو بھی کیسے؟ میں کوئی خوبصورت نہیں ہمارے محلے میں بھی تو کئی جوان اور خوبصورت لوگ ہیں، جو اس کے گھر کے قریب ہی رہتے ہیں جنہیں وہ ہر روز دیکھتی ہے، اس کے بھی تو رشتہ دار ہوں گے نا، ابھی پرسوں ان کا سارا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا، کتنے ہی آدمی تھے، سارا دن مجھے دکھائی بھی تو نہیں دی شام کو کہیں یونہی ایک جھلک دیکھی تھی، سارا دن ہی ضائع ہوگیا، اتنے لوگ تھے، رشتہ دار ہوں گے اور کون ہوسکتا ہے، اب بہت دن گزرتے جاتے ہیں، پتا تو لینا چاہیے کس سے پوچھوں، بی بی سے، اس سے کیا پوچھوں؟ یہی پوچھ لوں گا کہ کل پرسوں محلے میں ایک جگہ بہت سے لوگ اکٹھے تھے کیا بات تھی، مگر اسے کیا پتا ہوگا۔ بی بی تو اپنی گلی ہی میں آتی جاتی ہے، اسے کیا پتا یہ کون ہیں اور ان کے گھر میں کیا ہو رہا تھا۔

ایک شام تو وہ بیہوش ہی ہونے کو تھا، مغرب کی نماز پڑھ کے وہ حسب معمول جلدی جلدی گھر آرہا تھا کہ اسی موڑ پر وہ لڑکی سامنے سے آتی ہوئی اس طرح اس سے بھڑ کر گزری کہ اس کا رواں رواں تھرک اٹھا۔ اسے اتنی حیرانی ہوئی کہ وہ کچھ کہہ نہ سکا، مگر اُس کے رگ و ریشہ میں آگ دوڑ گئی۔ گھر وہ جوں توں کرکے پہنچ تو گیا مگر باوجود دن بھر کام کرنے کے وہ بہت عرصہ تک رات کو بالکل نہ سو سکا۔ اس پل بھر کے لمس نے اس کے بہت سے نامعلوم محسوسات کو جگا دیا، اُس وقت سے یہ خیال بھی اُس کے دل میں جگہ پا گیا کہ یہ مجھے کسی طرح مل جائے۔ میں کسی طور سے اسے پالوں، میں کسی طریقے سے اسے اپنا بنالوں، رات بھر سوچتا رہا مگر کوئی ترکیب کوئی ذریعہ ایسا نہ ملا جس کی بدولت اس کی شادی اس سے ہوسکے۔ بی بی سے وہ کیسے کہے کہ میری شادی وہاں کردو، شرم کے مارے مر ہی نہ جائے، اور اگر بی بی کو پتا بھی چل جائے تو روپے کہاں سے آئیں مانا کہ دس سال اس کی روزانہ اجرت اڑھائی روپے ہے اور کئی مکان تو تمام تر اسی کی نگرانی میں بنے اور چونکہ حساب وغیرہ بھی جانتا تھا اس مزید کام اور بعض دفعہ منشی گری کے بھی کہیں سے بیس پچیس روپے زائد مل جاتے تھے مگر بی بی کے سر پر قرضہ بھی تو تھا اور اگر کچھ جمع بھی کیا ہو، جس کا اسے علم نہیں تو اتنا تو ہرگز نہیں ہوگا کہ شادی ہو جائے اور جب کریم شادی کے متعلق سوچتا تو اُس کے دل کی حرکت تک بند ہوتی معلوم ہوتی۔ مگر اسے پتا نہیں کہ وہ ہیں کون اسے لڑکی دینا پسند کریں نہ کریں۔ نہ کوئی اُس کی جائداد تھی نہ زمین، صرف وہ مختصر سا مکان تھا نہ کوئی امیر رشتہ دار ہی تھا۔..

.....اپنی مایوسی اور بے بسی کے باعث اور اس لئے اور بھی کہ اُس کے متعلق اسے کچھ بھی علم نہ تھا اسے رات بھر بہت کاوش ہوئی۔ ڈر کے مارے کہ کہیں بی بی نہ جاگ اٹھے کروٹیں بھی نہ لیتا اور ایک طرف پڑا پڑا تھک بھی جاتا۔ جی چاہتا کہ باہر چلا جائے کہیں پھر پھرا آئے مگر اس خوف سے کہ کہیں بی بی کی نیند کھُل گئی تو دیکھ کے کیا کہے گی، وہیں لیٹا رہا۔

صبح اٹھا ہاتھ منہ دھو کر ابھی ناشتہ نہیں کیا تھا کہ ماں نے پوچھا بیٹا رات نہیں کوئی تکلیف تو نہیں تھی۔ اچھی طرح سوئے نہیں کریم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، کہنے لگا بی بی نہیں تو میں تو اچھی طرح سویا، نہیں کیوں خیال آیا، ماں نے کہا نہیں تو تم بہت رات تک بے آرام رہے میں جانتی

ہوں جس طرح تم سوتے ہو، رات تم بہت دیر تک سیدھے ہی لیٹے رہے۔ کریم نے کہا اچھا! مجھے تو خیال نہیں تھا! کچھ یونہی سوچ رہا ہوں گا۔ ماں نے اور کچھ نہ پوچھا مگر اس استفسار نے اس کی ہمت اور بھی پست کر دی۔ اس سے پہلے تو شاید ماں کو کچھ پوچھ ہی بیٹھتا اب حسب معمول جلدی جلدی روٹی کھا کے ویسے ہی چل دیا۔

مگر چہرہ ہشاش بشاش نہیں تھا ماں نے جاتی دفعہ پھر غور سے کریم کو دیکھا مگر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ موتیا کے پاس جب پہنچا تو وہاں کسی کو نہ دیکھا۔ اندر نظر دوڑائی تو لڑکی کے بجائے دو شخص آپس میں باتیں کرتے نظر آئے۔ کریم اور بھی فسردہ خاطر ہوا۔ دوپہر بھی یونہی گزری مگر شام آئی تو ایسی کہ سارے دن کو رنگین بنا گئی۔ شام کے دھندلکے میں وہی ایک روشن لمحہ تھا، مگر فقط ایک لمحہ، وہی جگہ تھی، وہی در و دیوار مگر اسے کچھ یاد نہ رہا، نماز بھی یاد نہ رہے، محلہ دار بھی یاد نہ رہے۔

ایک لمحہ مگر ایسا طویل لمحہ! ایک سیکنڈ کے لئے اُس کے پاؤں کریم کے سامنے آکر رک گئے، اُس کا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھو گیا، کریم کے سارے عزائم کمزور تمام منصوبے فراموش ہو گئے۔ خیالات، ارادے، خواہشات ایک دوسرے میں جذب ہو کر، اس کے دماغ پر دھند بن کے چھا گئے۔ اور یہ سب کچھ اس سرعت سے ہوا کہ اس لمحے کے بہت تھوڑے حصے میں کریم بت بن کے رہ گیا۔ آخر اُس نے کہا "بولتے ہی نہیں؟" کریم سے بمشکل ادا ہو سکا "جی! مگر پہلے اپنا نام بتا دیجئے" "نام! بس!!" اور پھر ایک متحیر وقفہ کے بعد "سکینہ"! یہ تھا وہ لمحہ! اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کریم کے لئے کچھ ایسا جنون انگیز تھا کہ وہ مدت تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کس طرح ہوا۔ مگر ایسے محسوس ہوا کہ دو بجلیاں ایک پل کے لئے اسے لپٹ گئی ہیں۔ اور پھر! وہی گلی! وہی دیواریں وہی مکان اور کریم . . . . . .

اس رات کریم بہت دیر سے واپس لوٹا۔ وہ رات عجیب جذبات کی رات تھی۔ کریم نے نہ کبھی ایسی رات دیکھی تھی اور نہ پھر اسے کبھی ایسی رات نصیب ہوئی۔ اس کا خون شعلے بن بن کے اس کے دل میں جا رہا تھا۔ اس کا دماغ خیالات کی یورش سے بے بس ہو رہا تھا، جذبات طوفان کی طرح اٹھتے تھے اور کریم کے لئے اپنے حواس قابو میں رکھنا مشکل ہو ہو جاتا تھا، مگر ایسی رات اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوئی +

دوسرے دن کی صبح ہی مختلف تھی، اس کے بعد ہر صبح ہی مختلف تھی۔ موتیا کا بوٹا بھی وہیں تھا، ان کا دروازہ بھی وہیں تھا، پھول بھی کھلتے تھے مگر کریم نے وہ ہاتھ، وہ چہرہ وہ جسم پھر کبھی نہ دیکھا۔ صبح ہوتی تھی، دوپہر ہوتی تھی، شام بھی ہوتی تھی مگر وہ مسکراہٹ، وہ لچک، وہ آواز پھر کریم کو کبھی نصیب نہ ہوئی +

آسمان زمین سبھی موجود تھے، مگر سکینہ معلوم نہیں کہاں چلی گئی تھی، دن پر دن گزرتے گئے، کریم پاگل سا پھرتا رہا، اُس گھر کے بیسیوں چکر لگاتا رہا۔ مگر وہ شکل اسے پھر نظر نہ آئی۔ کھانا بھول گیا، کام تک بے قاعدہ ہو گیا، مگر وہ شام پھر نہ آئی۔ ماں بے چین ہو گئی، سب دوست حیران رہ گئے، مزدور، مستری تک بھی آپس میں چرمے گوئیاں کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مگر کریم نہ دیکھنے والی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا اور کرتا۔ اسے اپنے ذہنی عذاب ہی سے فرصت کہاں ملتی کہ اور چیزوں کی طرف توجہ دے سکتا، جو اس کی موجودگی میں یہ نہ معلوم کر سکا کہ وہ کون ہے، وہ اُس کے جانے کے بعد کیا کسی سے پوچھتا کہ وہ کون تھی؟ کہاں چلی گئی؟ اس کا کون

جواب دینا؛ اُس کے خیالات اُس کے دماغ کو جھلس دیتے۔ مگر اپنے فطری ضبط کے باعث وہ کسی سے کچھ نہ پوچھتا+
سب حیران تھے۔ مگر کریم کے دل میں جو تاریکی تھی اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ کریم کی صدری میں جو خشک موتیا کے کچھ پھول تھے وہ کبھی کسی نے نہ دیکھے۔ کریم کو بھی سمجھ آتے آتے ہی آئی، مدت کے بعد ہی اس کے دل نے فیصلہ کیا کہ شاید وہ یہاں کی رہنے والی ہی نہ ہوگی، شاید کہیں سے مہمان بن کے ہی آئی ہوگی اور دس پندرہ دن رہ کے اسی بوڑھے کے ساتھ واپس چلی گئی ہوگی۔ مگر اس شام کو، جو آگ وہ اس کے سینے میں لگا گئی تھی، کبھی نہ بجھی+

فیاض محمود

غزل

میں گردشِ جامِ شہادت ہوں۔ مرہونِ صلائے عام نہیں
فرہاد کا خونیں افسانہ ہوں۔ شیریں کا پیغام نہیں

آفات کی بجلی کوندتی ہے۔ طوفانِ حوادث برپا ہے
میں اُس عالم میں رہتا ہوں جو واقفِ صُبح و شام نہیں

کیا لطف ہے پینے کا ہمدم جب جام بنے کشکولِ گدا
جو پیرِ مُغاں کے دست نگر ہوں۔ ہم وہ مے آشام نہیں

دریا میں اُتر۔ کیا ڈرنا ہے گرداب و نہنگ و اژدر سے
خود موجِ بلا کشتی ہے تری۔ کشتی سے تُجھے کُچھ کام نہیں

صیّاد! قفس میں جینا کیا۔ یا پھیر چھُری۔ یا چھوڑ مجُھے
ہے آرزوئے آرام مگر پابندی کا آرام نہیں

ساقی کے تصوّرِ رنگیں میں پی ساغرِ چشم سے خونِ جگر
اِس مے سی کوئی مے تُند نہیں، اِس جام سی بہتر جام نہیں

اب نشتر بسترِ مرگ پہ ہے دُنیا مُنہ دیکھنے آتی ہے
بس کوئی دم کا مہماں ہے وہ صُبح نہیں یا شام نہیں

نشتر جالندھری

حضرت نشتر کا مجموعہ کلام "زلورِ ہند" کے نام سے عنقریب شائع ہو رہا ہے+

میرا نجلی

(ٹیگور کی ایک نظم)

میں بھکارن جھولی پھیلائے، سڑک پر بھیک مانگ رہی تھی،
اتفاق سے اسی وقت تم بھی، اپنے رتھ پر سوار ہو کر نکلے تھے،

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

میری نگاہوں میں وہ سماں، خواب سا معلوم ہو رہا تھا،
تمہاری سج دھج، تمہاری موتی کی لڑیاں، سبھی چیزیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

میں نے سوچا، اچھی ساعت میں صبح ہوئی ہے
آج مجھے در در کی ٹھوکر نہ کھانا پڑے گی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

تمہارا رتھ دوڑے گا، خیرات سے سڑک کے دونوں اطراف بھر جائیں گے،
میں لوٹ لوٹ کر اپنی جھونپڑی کے کونے کونے کو بھر دوں گی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

لیکن میں نے دیکھا کہ یکایک تمہارا رتھ میرے پاس آکر رُک گیا،
تم ہنستے ہوئے اُترے اور تم نے میرا رستہ روک لیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

تمہارا جلوہ دیکھ کر میں اپنی ساری مصیبتیں بھول گئی،
میرے دل کی تمام سوزشیں سرد ہو گئیں، اور مصیبت ناک راتوں کی یاد فراموش ہو گئی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اسی اثنا میں معلوم نہیں کیوں، تم نے یہ کہہ کر کہ :-
"مجھے کچھ بھیک دو" جلدی سے اپنا نازک ہاتھ پھیلا دیا۔

٭ ٭ ٭ ٭

اے مالک! یہ کیا معاملہ؟ تم نے یہ کیسی بات کہہ دی؟
میں حیران ہو کر، کچھ دیر خاموش سر جھکائے کھڑی رہی۔

٭ ٭ ٭ ٭

تم کھڑے تھے، میں نے ہچکچاہٹ میں ایک چھوٹا سا کنکر
تم کو دے دیا، تم اسی کو لے کر فوراً چلے گئے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

گھر آ کر میں نے جھولی کھولی اور بے دلی کے ساتھ اس کو دیکھنا شروع کیا،
میں نے کہا کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟ اس میں یہ کیا چمک رہا ہے!

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

خیرات کی دوسری چیزوں کے درمیان، سونے کی ایک ڈلی پڑی ہوئی تھی،
میں نے بادشاہ بھکاری کو جو کنکر دیا تھا وہ اسی وقت سونا بن کر لوٹ آیا۔

٭ ٭ ٭ ٭

اُسی وقت سے ہر آن اور ہر گھڑی آنکھوں میں آنسو بھرے،
یہ سوچ سوچ کر روتی رہتی ہوں کہ میں نے اپنا سب کچھ تم پر کیوں نثار نہ کر دیا۔

ابو محمد **امام الدین**

نپولین محض بدخط نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جرمنی سے اُس نے جو محبت نامے اپنی بیوی جوزفین کو لکھے اُن کے متعلق پہلے یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ جنگی محاذ کے جلدی سے کھینچے ہوئے خراب نقشے ہیں +

بائرن انگریزی شاعر کا خط شکستہ تھا اور پروف پڑھتے وقت وہ متن کے ساتھ بہت سی نئی چیزیں لکھ دیتا تھا۔ ایک نظم جس کے دو سو اشعار تھے پروف درست کرتے وقت شاعر موصوف نے اُس میں پانچ سو شعر اور ایزاد کر دیئے +

گلچیں



افسانے کا انجام



رفتار



آئینہ جوئبار



تاش کی بازی

Victoria Press, Lahore.



دو بہنیں

Victoria Press, Lahore.

زاہدہ

زاہدہ روحِ باغِ جنّت ہے　　کیسی من موہنی سی مورت ہے

رخِ روشن پہ شانِ معصومی　　ہے مری جان جانِ معصومی

اس کی غوں غوں سے بیقرار ہے دل　　سوزِ الفت سے شعلہ زار ہے دل

مجھ کو یہ جان سے بھی پیاری ہے　　بلکہ ایمان سے بھی پیاری ہے

یہ مرا مرکزِ محبت ہے　　ثمرِ اولینِ اُلفت ہے

مئے سرجوشِ عشق کا وہ سرور　　ہو گیا ہے عیاں بصورتِ نور

کیا ہی نکلی بہ فضلِ ربِّ قدیر　　میرے خوابِ وفا کی یہ تعبیر

تو اگر سن لے اے خدا میری　　مختصر سی ہے یہ دعا میری

پیروِ شیوۂ بتول ہو یہ

باغِ نسوانیت کا پھول ہو یہ

جلال الدین اکبر

چاننی رات کی سیل

(کارخانے کے ایک کاریگر کی زبانی)

ذیل کی عبارت پڑھتے وقت زیر و زبر اور الفاظ کی عجیب و غریب تبدیلیوں کو ضرور ملحوظ خاطر رکھئے۔

روٹی کا ٹکڑا کھا کے میں سنے ذری کے ذری کمر ٹکائی تھی کہ اتے میں کسو نے مجھے آواز دی۔ میں ذلدی سے کرتا گلے
میں ڈال باہر گیا مگر واں کسو کا بھی پتہ نئی۔ ذرا اور اگاڑو بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گلی کے نکڑ پہ کمیٹی کی لالٹین کے نیچو چیا امتیاز
کا لمڈا منتیاز کھڑا وا ہنس ریا ہے۔ میں نے وِس سے کیا کہ بے یہ کیا بے وحدت پنا ہے کہ اواز لگا کے یاں آن کھڑا ہوا
اور میں اس فکر میں ہوں کہ جنے کون تھا۔ منتیاز بولا خلیفہ میں کیا کروں تماری نالی اتی سڑ ری ہے۔ کہ میرا دماغ پھٹا جا
ریا تھا۔ مجبوراً بنا چاری ادر میں یاں آن کھڑا ہوا۔ میں نے کیا ہاں مجھے داروغہ صفائی کی رپٹ کروانی پڑے گی۔ مگر ہاں یہ تو بتاؤ کہ
تمارا کس طریوں آنا ہوا۔ وہ بولا خلیفہ دیکھ رئے ہو چودھویں رات کا چاند کھل ریا ہے۔ میں نے سونچا اس وخت چاننی کی سیل میں بڑا لُطف
آئیگا اس لئے گھر سے چل نکلا۔ رستے میں خیال آیا کہ تم کو بھی لیتا چلوں۔ میں نے کیا۔ آؤ تو خونی دروزے تو ڑی تک ہو آئیں۔ یہ
کیکے ہم دونوں ٹھنڈی سڑک پہ ہو لئے۔ منتیاز بولا خلیفہ میری چندیا میں کھجلی ہو ری ہے میں نے کیا خدا خیر کرے تماری ٹانٹ کھجلا ری ہے کہیں تمارے جوتے نہ پڑجائیں وہ
بولا اللہ ٹُرنی جیسی ہو گی دیکھی جائے گی۔ اب قضا کار التفاق ایسا آن کے پڑا کہ ہمارے آگو سے ایک عورت برخا اوڑھے دے
ایکلی آتی نظر آئی۔ منتیار وِسے دیکھ کے بولا لو خلیفہ چپڑی اور دو دو۔ چاننی کی سیل میں وِس عورت سے ذرا دل لگی ہی رہے گی۔ میں
نے کیا کہ بے تو بھی بڑا بے شحورا ہے کہ بنا جانے بوجھے بغیر کسو عورت سے چھیڑ خانی کرنے کی سوچ ریا ہے مگر یہ جان لے کہ اس کا
انجام کار اچھا نہیں ہوں کہ اگر وہ ہوئی کسو بڑے خاندان کی تو پھر اُلٹی آنتیں گلے پڑیں گی اور پیچھا چھٹانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ بولا اگر
خاندانی عورت ہوتی، اس طریوں ایکلی نہ نکلتی۔ میں نے کیا وہ زمانہ لدگیا اب تو رب جنگہ بڑے بڑے رئیسوں کی عورتیں یونہی پھرتی
ہیں کیونکہ آج کل کا فاشن ہی یہی ہے۔ غرض بتیرا میں نے منتیاز کو سمجھایا مگر وِس پہ تو شیطان سوار تھا، وہ کھلا کہ مانتا۔ میں نے بھی
کہدیا اچھا پیارے جو تیرا مجازہ جائے کر۔ میں تو پرے سے تیری سیل دیکھوں گا۔ اتے میں وہ برخے والی عورت برابر میں آگئی میں
تو پرے ہٹ گیا تھا منتیاز نے وِس سے ہنس کے کیا کہ سرکار ہم بھی تمارے ساتھ چلیں۔ وہ عورت پہلے تو چپ ہو گئی اور ذرا تیزی
سے چلنے لگی مگر جب منتیاز نے وِس کا پیچھا کیا اور پھر وِس پہ کچھ آوازہ کسا تو وِس نے نہ ایک کہی نہ دو سنی نکال پیر سے اونچی ایڑی کا
جوتا اور اب جو منتیاز کے سر پر تڑا تڑ رسید کیا تو منتیاز تو اپنی چوکڑی بھول گیا۔ اتے میں وِس عورت کے بھائی بند جو دوسری پٹڑی
پہ چل رے تھے وہ بھی واں آدھمکے۔ دونوں نے جو یہ ماجرا سنا اور دیکھا تو وہ بھی منتیاز کو چمٹ گئے اور مار مار کے وِس کا بھرکس

نکال دیا۔ رُتے ہیں واں پہ بوت سی خلق خدا جمع ہوگئی۔ ایک سپاہی بھی آگیا وس نے منتیاز سے دریافت کیا کہ کیا بات تھی۔ منتیاز بولا ہیں نے وِن سے یہ کہا تھا کہ بی تم اکیلی جارئی ہو کوئی بدماش تمیں رستے میں چھیڑے نئی۔ تم کئو تو میں تمیں تمارے گھر توڑی پونچادوں۔ سپاہی بولا یعنیں بھی تو تیری اماں کہ تجھے وِن کا درد آیا۔ وہ عورت بولی کہ اس بدماش کو کتوالی لے جاؤ۔ تتے میں ایک جنٹلمین آگو آن کے بولا کہ ایسے لوگوں کو برضرور سزا ملنی چھیے اور پھر وِس عورت کے بھائی بندوں سے بولا کہ آپ جائے خفا کیوں نہ ہوں تھوڑی سی غلطی آپ کی بھی ہے کہ آپ اپنی عورت کے ساتھ اِسی پٹڑی پہ کیوں نہ چلے دوسری پٹڑی پہ کیوں چلتے رئے بھلا اپنے گھر کی عورت کے ساتھ ساتھ چلنے میں کیا ہرجہ ہے۔ میں تو کیتا ہوں کہ اگر آپ پرے نہ چلتے بلکن ساتھ چلتے تو اس بدماش کو اِتی ہمت ہی نہ ہوتی۔ خیر اسی اثنا کے بیچ میں وہ سپاہی منتیاز کو کتوالی کی طرف ے کر چل چکا تھا میں لپک کے وِس کے پاس پہنچ گیا۔ اور اگرچہ وِس سپاہی کا اور میرا بڑا یارانہ تھا۔ مگر جدہیں نے کہا کہ د رو غجی منتیاز کو چھوڑ دو تو وِس نے صاف جواب دیدیا۔ میں نے دل میں سونچا کہ جد توڑی وِس کی مٹھی گرم نہ کردگے کام نئی بنے گا۔ خیر میں نے ایسا ہی کیا اور منتیاز کو چھڑا کے میں نے دِس سے کیا کہ جاؤ اب چاننی رات کی سیل تو دیکھ لی۔ گھر جا کے آئینہ میں اپنی حالیت بھی دیکھ لو اور آج سے پیچھو کدھی ایسی حرکت نہ کرنا ورنہ یہ سمجھ لو کہ آج تو تم بچ گئے مگر آیندہ بڑے گھر کی ہی ہوا کھاؤ گے۔ مانو یا نہ مانو یہ تمارا کام ہے۔ مگر ہم تو تم کو زبردصیت کئے جائیں گے ۔

ایم اے مغنی دہلوی

اگر تمیں حقیقی زندگی کی جستجو ہے۔ تو فراخ سڑکیں اور عظیم الشان عمارتیں چھوڑ کر تنگ و تاریک گلی کوچوں اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں چلے جاؤ۔

امارت کی زندگی تصنع کا دوسرا نام ہے اور تہذیب انسانی فطرت کی منافقت کا۔

غریب اصلی زندگی بسر کرتے ہیں اور امرا مصنوعی۔ امیر چند ہیں اور غریب لاتعداد۔

حامد

قوسِ قزح

حسنِ فطرت کس نرالی شان سے ہے جلوہ گر
لوٹتا ہے دل مرا قوسِ قزح کو دیکھ کر

زلف و ابروئے بتِ دلجو میں ایسا خم کہاں
ماہِ نو کے خم میں یہ انداز یہ عالم کہاں

ہے ہلال اک خطِ سیمیں جس میں تھوڑی سی چمک
حسنِ گلنار رنگ کی مظہر ہے یہ پیاری دھنک

کہکشاں کو گر کبھی آئے نظر اس کی بہار
مثلِ گوہر اس پہ کر دے اپنے تاروں کو نثار

چاند کے ہالے میں کب ہیں ایسی دل آویزیاں
اس طرح کی جلوہ ریزی ایسی رنگ آمیزیاں

گر کبھی بادل کے پردے سے نکل آتی ہے برق
رُوپ اس کا دیکھ کر روپوش ہو جاتی ہے برق

اس کے آگے لاجوردی اُفق کیا چیز ہے
رنگِ گل، رنگِ سحر، رنگِ شفق کیا چیز ہے

موج پانی کی کبھی دم بھر ٹھہر سکتی نہیں
کس طرح یہ رنگ کی امواج ساکن ہو گئیں

اتنے رنگوں کی نہیں عالم میں کوئی ایسی شے
قصرِ فردوسِ بریں کی یہ کوئی محراب ہے

وجد آور گرچہ ہیں آثار و انوارِ سحر
پر کہاں اس طرح کی جدول بیاضِ صبح پر

لو وہ آئی رعد سے توپوں کے دغنے کی صدا ابر کی فوجوں کے رایت کا یہ پرچم کھل گیا
ہو گیا ہے کیا سے کیا ما رنگِ فضا تو دیکھئے ابر کی پیاری ردا کا حاشیہ تو دیکھئے
یا ہوا سے حور کا مُوباف اُڑ کر آ گیا جو فضا میں رہ گیا اس طرح لہراتا ہُوا

ہر کماں کے تیر تو کرتے ہیں جانوں کا شکار یہ کماں ایسی ہے جس کا تیر ہے بارش کی دھار
واہ کیا پیاری کماں ہے کیا نرالے ہیں خدنگ کھیتیاں سرسبز جن سے اور گلشن لالہ رنگ
اب پڑیں گے ڈونگرے جھڑیاں بھی اب لگ جائینگی اب تمنائیں ہر اک جاندار کی بر آئیں گی
ندیاں ہوں گی رواں نالے بہیں گے زور سے گونج اُٹھے گی وادیٔ خاموش جن کے شور سے
بیل بوٹے، روکھ پودے پُر فضا ہو جائیں گے دو ہی دن میں کوہ و صحرا کیا سے کیا ہو جائینگے

مرحبا اے قاصدِ بارانِ رحمت مرحبا
باعثِ تسکینِ عالم ہے نظر آنا ترا

میر سعادت حسین نجیب

چند بیل

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ خاموش بیٹھا جگالی کر رہا ہے۔ آنکھیں نیم باز ہیں۔ ادھر ایک کتا بڑی مشقت تن دہی اور انہماک کے ساتھ اُس کے مُنہ کے سامنے کھڑا بھونک رہا ہے۔ بھونکے جا رہا ہے۔ بڑھ بڑھ کر بھونکتا ہے اور پیچھے ہٹتا ہے۔ آخر جب کتا بہت قریب پہنچ گیا تو بیل نے زور سے "سوں" کر کے یوں سر ہلا دیا جیسے ہم آپ نفی کے طور پر سر ہلاتے ہیں۔ کتا پچھاڑ کھا کر بھاگا اور بدحواسی میں ایک آدمی سے جس کے سر پر ایک ٹوکرا تھا لڑ گیا اور ٹوکرا گر گیا۔ بیل خاموش بیٹھا جگالی کرتا رہا۔

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ اُس کے پیچھے ایک چھوٹا کتا اور دو عدد پاؤ ڈیڑھ پاؤ وزن کے پلّے دوڑ رہے ہیں۔ بیل نے بدحواسی کر ہاکی فیلڈ کا رُخ کیا۔ ایک خوانچہ لوٹ دیا۔ ایک بنچ مع لڑکوں کے پھاند گیا۔ میدان میں جب لڑکے دوڑے تو گول میں گھس پڑا۔ اِس طرح کہ جالی توڑ کر پار نکل گیا۔ سوچا ہو گا کہ آج بال بال بچے۔ کیونکہ کتے اُس سے الگ ہو گئے۔

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ اُدھر سے آرہا ہے۔ اِدھر سے میں جا رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب سے گزرے۔ سردی کے دن تھے۔ وہ ٹاٹ کا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا اور میں اُون کا اوور کوٹ پہنے تھا۔

ایک بیل نے (جس کا لقب سانڈ تھا) ایک چھوٹی سی بیل گاڑی پر حملہ کیا جس میں میں بیٹھا تھا۔ دو بیل گاڑی کے اور تیسرا یہ سانڈ ان تینوں کی کوشش کیئے یا بدعنوانی سے نتیجہ یہ نکلا کہ گاڑی کا ایک پہیہ بڑے مزے سے ایک ڈیڑھ فٹ اونچی چبوتری پر چڑھ گیا۔ گاڑی ٹوٹ گئی۔ نیچے ہم لوگوں کے بھوسا رکھا تھا۔ چوٹ کم لگی مگر گت خوب بنی۔ سانڈ ادائے فرض کے بعد بھاگ گیا۔

ایک مرتبہ میں بیل گاڑی پر بڑی دور جا رہا تھا۔ ایک بیل موٹا تھا اور ایک دبلا جو موٹا تھا وہ سُست چلتا تھا اور مار کو بھی کسی شمار قطار میں نہ لاتا تھا۔ میں نے تنگ آکر گاڑی والے سے کہا کہ اس کو خوب مارو۔ وہ بولا کہ اسے زیادہ مارا تو یہ فوراً نان کوآپریشن کر دیگا۔ اور چلتے چلتے بیٹھ جائیگا پھر چاہے کاٹ ڈالو مگر یہ نہ اُٹھے گا۔ مجھے یہ بات ناممکن معلوم ہوئی اور اُس کو پٹوایا۔ نتیجہ یہ کہ وہ بیٹھ گیا۔ اور بری طرح مارا اور کھڑا کرنے کی کوشش کی تو وہ لیٹ گیا۔ اب قیاس میں آنا ناممکن ہے کہ کس کس طرح اُس کو مارا مگر نہ اُٹھنا تھا نہ اُٹھا۔ آنکھوں پر مارا، سینگوں پر مارا، منہ توڑ دیا، مگر وہ لیٹا رہا۔ جب میں ہار گیا تو کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر دم لینے لگا کیونکہ مارتے مارتے تھک گیا تھا۔ سگرٹ سلگایا۔ گاڑی والے نے اپنی چلم سلگائی۔ نہ معلوم مجھے کیا سوجھی کہ گاڑی والے کی چلم لے کر بیل کی دم کے نیچے جلتی ہوئی مہر کی طرح لگا دی۔ میں آپ سے کیا عرض

کروں کہ کیسے وہ تڑپ کر اُٹھا ہے کہ بیان سے باہر ہے پھر لطف یہ کہ سولہ میل تک اُس کو ہر طرح مارا مگر پھر کبھی نہ بیٹھا چند مہینے بعد گاڑی والا پھر ملا اور کہنے لگا کہ بس ایک دفعہ اور لیٹ گیا تھا مگر وہی ترکیب جو کی تو پھر کبھی بھول کر بھی اُس نے ایسی غلطی نہیں کی۔

ایک بیل کی طبیعت خراب ہوگئی یعنی ہماری اور آپ کی طرح۔ زبان میں چھالے پڑ گئے۔ ایک دیہاتی سول سرجن آئے جو ذات کے چمار تھے۔ اُنہوں نے معائنہ کیا، تیل اور نمک طلب فرمایا۔ دونوں کو ملا کر ایک برتن میں رکھا۔ بیل کو پیر باندھ کر گرایا اور پھر زبان اُس کی باہر نکال کر ایک ٹھیکرے سے زبان کے چھالے بری طرح چھیلے۔ اُس کے بعد نمک اور تیل اچھی طرح زبان پر ملا اور اُس کے بعد بڑی صفائی سے اپنا جوتا اتار کر زمین پر اُس کا تلا رگڑ رگڑ کر زور زور سے بیل کی زبان کو رگڑا۔ پھر چھوڑ دیا۔ بیل صاحب کھڑے کر دیئے گئے۔ ناک میں تریان بار بار ڈال رہے تھے۔ آپریشن نہایت ہی کامیاب رہا۔ بیل صاحب تیسرے ہی روز صحت یاب ہو گئے۔

ایک بیل صاحب کو میں نے دیکھا جن کی قیمت معلوم ہوا پانچ سو اسی روپے ہے۔ وہ اس طرح پر کہ اسی روپیہ کے تو وہ خود تھے اور پانچ سو روپیہ کا نوٹ کھا گئے تھے اور کھا کر فوراً بھاگ گئے اور دن بھر نہ ملے ورنہ غالباً قتل کر دئیے جاتے

ایک مرتبہ ہم لوگ شکار کو گئے۔ مستقر سے شکارگاہ تک بیل گاڑی سے پہنچے۔ ایک مناسب مقام پر گاڑی چھوڑ دی اور شکار میں مشغول ہو گئے۔ ہم سب لوگوں کا اور بیلوں کا ناشتہ گاڑی میں رکھا تھا۔ ایک بیل صاحب اپنا ناشتہ کھاتے کھاتے ہم لوگوں کے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سالن کی قسم سے جتنی چیزیں تھیں وہ زیادہ تر پھینک دیں۔ پراٹھے کُل کے کُل کھا لئے اور دسترخوان کھا رہے تھے کہ ہم لوگ بھوک کے دھارے رکھے ہوئے کھانے کے لئے پہنچے جو ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیل صاحب دسترخوان کھانے میں مشغول ہیں۔ درحالیکہ ہم گیارہ بجے کے، یہ سوچنے لگے کہ دسترخوان پراٹھوں سے پہلے کھایا جاتا ہے یا پراٹھوں کے بعد۔ معلوم یہ ہوا کہ پراٹھوں کے بعد کھایا جاتا ہے۔ مر مر گئے مارے بھوک کے۔ بس یہ تھا ورنہ جس نے ہمارا ناشتہ کھا لیا ہم اس کا ناشتہ کھا جاتے۔ کچھ بھی ہو۔ یہ پتا چل گیا کہ شکار اِس کو کہتے ہیں۔

ایک بیل صاحب کے بے تکلف احباب میں سے ایک کتے صاحب تھے۔ جب بیل صاحب واپس تشریف لاتے تو کتے صاحب خوش ہو جاتے اور دو پیر سے کھڑے ہو کر اُن سے گلے ملتے۔ جھوٹ موٹ اُن کے پیروں میں کاٹ کاٹ کر بھاگتے اور یہ تمام باتیں بیل صاحب خندہ پیشانی سے گوارا فرماتے بلکہ جواباً کتے صاحب کو محبت کی نظر سے دیکھتے۔ صبح معمول تھا کہ بیل صاحب تشریف فرما ہیں اور اُن کے بے تکلف دوست صاحب اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُن سے کھیل رہے ہیں۔ دوپہر کو کتے صاحب اپنے دوست کے بالکل ہی پاس آرام فرماتے تھے۔

آگرے میں ایک سانڈ صاحب ہیں۔ اُن کا دستور ہے کہ کسی مٹھائی کھٹائی کی دوکان پر کھڑے ہو کر کھانا شروع کر دیا۔ اب لوگ مار رہے ہیں تو وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ محبت ہے یعنی لوگ مار مار کر کھلا رہے ہیں۔ لہٰذا جہاں تک مار یا زد کی وجہ سے ہٹنے یا ہٹانے کا تعلق ہے وہاں تک ہٹنے سے کیا مطلب۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے سامنے ہی سے چیز اُٹھالی۔ چنانچہ جب میزبان کی اس طرح سے نیت معلوم کر لی تو پھر ٹھہرنا بیکار خیال فرماتے ہیں۔

ایک بیل میں بی اے (بیل والا) جن کا نام ایڈیٹر ہے اُنہوں نے ایک اعلیٰ درجے کا علمی و ادبی رسالہ جاری کر رکھا ہے اور لطف یہ کہ جنوری میں سالگرہ نمبر کا اہتمام بھی فرماتے ہیں۔ آپ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ دسمبر کے پرچے میں ایک عجیب و غریب عنوان تجویز فرما کر میرا نام چھاپ دیا کہ ہمارے "مشہور مزاحیہ نگار" اس پر مضمون لکھیں گے اور یہ مضمون جانوروں کے مطالعہ کا ایک دلچسپ باب ہو گا۔ اب آپ ہی کہئے کہ میں کیونکر اُن کے اس عجیب و غریب مطالبہ سے عہدہ برا ہوں۔

عظیم بیگ چغتائی

رباعیات

اِنّی اَعلَمُ ما لا تَعلَمُون

بیروں از حدِ خویش قدم ننہند
در وادیٔ ہولناک سخن ننہند
چیزیکہ بچشم ہمہ نیاید در دوست
تسمعیست کہ لطف از قدم ننہند

وَفی اَنفُسِکُم اَفَلا تُبصِرُون

دادم بہ تلاش او صدا بہ برد
درویش مثال در دو بیم دارد
جاشیں در پی چشم و چشم پیر سو بیں نگراں
او با در بر و با من با نشکار نشستن دارد

اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرض

گہ با دیدۂ او چشم بدوز و بر دل
گہ چشم ہمی نہ بکشا چشم ز دل
گفتم کہ بجاست ای آخر آن پردہ نشیں
دل گفت کہ بکشا چشم چشم گفت اندر دل

وحدۃ الوجود

تا چند بسر کوئے یار و در پا بینی
تا چند فضائے باغ و صحرا بینی
تا زینۂ وحدت الوجود ار برسی
در خود ہمہ و در ہمہ خود را بینی

سید احمد حسین امجد

غمِ روزگار

(۱)

میں اک حکیم ہوں میرے حریمِ دانش میں
نوائے سازِ حقیقت ہے نغمۂ تمثیل

ضمیرِ دہر پہ فطرت کے راز کُھل نہ سکیں
گرہ کُشا جو نہ ہو میرا ناخنِ تاویل

مری نگاہ میں پنہاں حقائقِ تخلیق
مرے خیال میں رخشاں معارفِ تکمیل

بہارِ گلشنِ اسرار ہے مری توضیح
ضیائے جلوۂ پندار ہے مری تفصیل

میں اُس فضا میں ہوں سرگرمِ سیرِ شام وسحر
جہاں ہے عاجزِ پروازِ شہپرِ جبریل

مگر بایں ہمہ دانش غمِ زمانۂ تلخ
بُجھا رہا ہے مری بزمِ فکر کی قندیل

ہوئے ہیں جس سے ارادات دلنشیں مجروح
کیا ہے جس نے مری ہمتوں کو پست و ذلیل

تجھے دکھاؤں کہ کیا چیز ہے مری ہستی
ہزار جلوۂ باطن ہیں طالبِ تحصیل

یہ خار کاش مرے قلب سے نکل جائے

(۲)

میں ایک صاحبِ اہل وعیال، شوہر ہوں
مری مسرتِ معصوم صد چمن بردوش

طلوعِ صبح کے ہمراہ مسکراتی ہے
سکوتِ شب میں سناتی ہے نغمۂ خاموش

عطا ہوئی ہے وہ چھوٹی سی سلطنت مجھ کو
کنارِ امن ہے جس کا طرب فزا آغوش

مری حدودِ شہی میں عداوتیں مفقود!
مرے چمن کی فضا میں خزاں بہار فروش

مگر زمانۂ نااہل کی ستم گاری
دبا رہی ہے مرے ولولوں کا پیہم جوش

مری جبیں سے عیاں ہے مری شکستہ دلی
اگرچہ شاہدِ عشرت ہے میری حلقہ بگوش

بتا کہ اُس کے سمجھنے کی تجھ کو قدرت ہے
وہ تلخ ساعتِ ہستی، وہ برقِ خرمنِ ہوش

کہ تیرے سامنے معصوم ہستیوں کے لئے ۔۔۔ جب ایک چاند سے زائد حسین صہباپوش
سجی ہو جلوۂ عصمت سے جس کی پیشانی ۔۔۔ جو نشۂ مئے پاکیزگی سے ہو مدہوش
کھڑی ہو چشم غزالیں میں ڈبڈبائے اشک ۔۔۔ نگاہِ حُزن بہ دامن، نوائے غم بردوش
اور اُس کی ہو نہ سکیں تجھ سے حاجتیں پوری ۔۔۔ اگرچہ تو ہو خرد آشنا و صاحبِ ہوش
غرض ہزار مصائب ہیں تلخ و صبر شکن ۔۔۔ یہ زندگی ہے مرے حق میں موت کا آغوش

خدا کرے کہ زمانے کا رُخ بدل جائے!

(۳)

میں ایک شاعرِ رمز آشنائے فطرت ہوں ۔۔۔ مری نگاہ میں ہے خوب وزشتِ شام وسحر
ہر ایک پھول ہے میرے لئے حریمِ جمال ۔۔۔ کلی کلی میں ہیں صد جلوۂ بہشتِ نظر
اِدھر سحر ہے بہ اندازۂ ربابِ نشاط ۔۔۔ اُدھر ہی شام بہ طرزِ سرودِ کیف اثر
تجھے ہے سطح کے جلووں سے یکسر اطمینان ۔۔۔ مری نگاہ ہے باوصفِ تہ رسی مضطر
محاربات میں پاتا ہوں گاہ خاموشی ۔۔۔ کبھی خموش فضاؤں میں شورشِ محشر
وہاں ہوئی ہے ضیا بار میری شمعِ دماغ ۔۔۔ چراغِ کشتہ ہیں جس انجمن میں شمس و قمر
مری نگاہ سے تو کاش اِس کو دیکھ سکے ۔۔۔ یہ کارخانۂ ہستی ہے اِک فریبِ نظر
مگر وہ رُوح کہ غمگینیوں سے ہے لبریز ۔۔۔ رہینِ بےخبری ہے جو باوجودِ خبر
جسے کیا ہے زمانے کی سرد مہری نے ۔۔۔ قفس رسیدۂ آلام طائرِ بے پر
حیات جس کے سبب سے ہوئی ہے "مرگِ حیات" ۔۔۔ نشاط جس کے اثر سے ملالِ غم پرور
اِسی سے ہے مرے افکار کی جبیں تاریک ۔۔۔ اِسی سے ہے مری لیلائے شعر خاک بسر

تجھے دکھاؤں جو حالت مری سنبھل جائے!

علی اختر
(از حیدرآباد دکن)

دوست یا دشمن

(۱)

چھ مہینے کے بعد کلکتہ سے گھر آنے پر دیا کرشن نے پہلا کام جو کیا وہ اپنے عزیز دوست سنگار سنگھ سے ماتم پرسی کرنے جانا تھا۔ سنگار سنگھ کے والد کا آج تین مہینے ہوئے انتقال ہو گیا تھا۔ دیا کرشن انتہائی مصروفیت کے باعث اُس وقت نہ آسکا تھا تعزیت کی رسم خط سے ادا کردی تھی۔ لیکن ایسا ایک بھی دن نہیں گزرا کہ اس کے دل نے سنگار سنگھ کے ساتھ دوستی کا فرض ادا کرنے کے لئے تحریک نہ کی ہو۔ شاید ابھی دو چار مہینے اور نہ آتا، کیونکہ کلکتہ میں اس نے جو کاروبار جاری کیا تھا اُسے مستقل صورت میں لانے کے لئے اُس کا وہاں موجود رہنا ضروری تھا اور اُس کی عارضی غیر حاضری سے بھی نقصان کا احتمال تھا مگر جب سنگار سنگھ کی بیوی لیلا کا اشد ضروری فرمان پہنچا تو وہ اپنے کو روک نہ سکا۔ لیلا نے صاف صاف تو کچھ نہ لکھا تھا اُسے فوراً بلایا تھا لیکن دیا کرشن کو بین السطور سے یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ وہاں کی حالت تشویش ناک ہے اور اس وقت اُس کی امداد ضروری ہے۔ سنگار خوشحال باپ کا بیٹا تھا، مگر بڑا ہی الھڑ، بڑا ہی ضدی، بڑا ہی آرام پسند، ارادہ یا استقلال اسے چھو بھی نہیں گیا تھا۔ اُس کی ماں اُس کے بچپن ہی میں مر چکی تھی اور باپ نے پدرانہ تادیب کی جگہ مادرانہ شفقت ہی سے اس کی پرورش کی تھی اور اس کا نتیجہ وہی ہوا تھا جو مرغن غذا کھانے والے نامحنت پسند نوجوانوں کا ہوتا ہے جو دیکھنے میں تو فربہ ہوتے ہیں مگر دس قدم چلنا مشکل۔ پودے کو محض پانی کی ضرورت نہیں ہوتی، اتنی ہی دھوپ کی بھی ضرورت ہوتی ہے ورنہ پودا ہرا بھرا ہونے پر بھی پھل پھول نہ لا سکے گا۔ سنگار کو والد سے بے انتہا محبت تھی، جوان ہو کر بھی وہ ذرا ذرا سی باتوں میں والد کی ہدایت کا محتاج تھا۔ باپ بھی شاید بھول گیا تھا کہ یہ نازبرداری سنگار کو تباہ کر رہی ہے۔ لڑکے کی یہ عقیدت اور تکیہ پسندی اُس کی پسر نواز آنکھوں میں سعادتمندی کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اور اسے وہ اپنی خوش نصیبی سمجھتا تھا۔ سنگار جوان بچہ تھا، اتنا ہی خالی الذہن اتنا ہی تلون مزاج۔ وہ اتنے بڑے کاروبار کو کیسے سنبھال سکے گا؟ اس میں نہ وہ معاملہ فہمی تھی نہ وہ جزرسی، جو کاروبار کے لئے ضروری ہے۔ شاید اس کے والد نے اُسے دُنیا سے بے نیاز رکھنے کا بار بھی اپنے ہی سر پر لے لیا تھا۔ ایسا آدمی کارپردازوں اور مختاروں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بننے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔ اسی قسم کے اندیشے دیا ناتھ کے دل میں پیدا ہوتے رہتے تھے۔

(۲)

اُس کی خبر پاتے ہی سنگار سنگھ باہر نکل آیا اور اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ دیا کرشن اس کی وضع قطع دیکھ کر حیرت میں آگیا اُس نے سوچا تھا سنگار روتا ہوا باہر آئے گا، متفکر اور پریشان اور اپنے والد مرحوم کی وفات کی داستان بیان کرے گا لیکن سنگار کے چہرہ پر حزن وملال کا نام بھی نہ تھا۔ وہ بہت ہی بشاش نظر آتا تھا، بال سنوارے، آنکھیں سُرخ، ریشمی مہین کرتا اور مخملی سلیپر پہنے

ہوئے۔ گویا محفلِ نشاط سی اُٹھا آتا ہو۔ دیا کرشن اس وقت کچھ طے نہ کرسکا ماتم پرسی کرے یا مبارکباد دے +

سنگار سنگھ نے شکوہ کے انداز میں کہا۔ آتے آتے اب آئے ہیں آپ۔ چھ مہینے بعد، بس ایک خط لکھ دیا اور فرصت ہوئی

دیا کرشن نے اپنی مجبوری اور معذوری کا اظہار کیا اور سردار صاحب مرحوم کی وفات سے جو صدمہ اُسے ہوا تھا اس کا بھی ذکر کرنا چاہتا تھا کہ سنگار سنگھ نے بات کاٹ دی +

مرنا جینا تو دُنیا کا دھندا ہے جی۔ اسے کوئی کہاں تک روئے۔ پھر پاپا کی عمر بھی کافی تھی۔ اس عمر میں انہیں مرنا ہی چاہئے تھا۔ مجھے تو ان بوڑھوں پر رحم آتا ہے جو خواہ مخواہ جیتے چلے جاتے ہیں۔ بھلے آدمی کے لئے پچاس ساٹھ سال بہت ہیں یہ نہیں کہ ستر سے آگے بھی جینے کی ہوس بنی رہے۔ اگر سب بوڑھے زندہ رہیں تو نوجوانوں کے لئے گنجائش کہاں سے آئے +

یہ کہہ کر اُس نے زور سے قہقہہ مارا۔

دیا کرشن نے اور بھی استعجاب میں آ کر پوچھا۔ کاروبار تو اچھی طرح چل رہا ہے؟ اگر میرے سپرد کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو میں تمہاری خدمت کو حاضر ہوں۔ ابھی میں یہاں دو تین مہینے رہوں گا، اور کلکتہ بھی گیا تو ضرورت پڑنے پر آجایا کروں گا، تمہارے کاروبار میں نگرانی کی سخت ضرورت ہے +

سنگار نے گویا اس تذکرہ سے بیزار ہو کر کہا، بھئی میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔ تھوڑی سی زندگی ہے اسے اس خلجان میں کیوں برباد کردوں۔ مجھے تو چچا صاحب کی پالیسی پسند ہے۔ عیش کرو اور فکر کو کبھی پاس مت آنے دو۔ چچا صاحب اور پاپا دو متضاد طبیعت کے آدمی تھے۔ پاپا کو شب و روز کاروبار کی فکر رہتی تھی، اسی کا خواب بھی دیکھتے تھے۔ اپنی زندگی کے تیس سال اسی کی نذر کر دیئے اور بالآخر پچپن سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ چچا صاحب اُن سے دس سال بڑے ہیں کبھی کوئی مستقل کام نہیں کیا۔ ہمیشہ عیش سے رہے اور آج ۶۵ سال کی عمر میں زندگی کے مزے اڑا رہے ہیں، فرق یہی ہے کہ پاپا نیک نام تھے، چچا بدنام ہیں۔ لیکن مجھے نیک نامی کی پروا نہیں۔ جان دے کر نیک نامی حاصل کرنا میری سرشت میں نہیں ہے۔ میں نے اپنا سارا کاروبار انہیں سونپ دیا ہے، بلکہ یوں کہو کہ انہوں نے سارا بار اپنے اوپر لے لیا ہے۔ میں آزاد ہوں جو چاہوں کروں۔

دیا نے جس ابتری کا اندازہ کیا تھا، صورتِ حالات اس سے کہیں ابتر تھی۔ سنگار سنگھ کے چچا سردار کرتار سنگھ اُن ذات شریفوں میں تھے جو عیش پروری میں اپنا سب کچھ، یہاں تک کہ ضمیر بھی قربان کر دیتے ہیں۔ سنگار سنگھ کے والد سردار اوتار سنگھ اپنے بڑے بھائی کے سائے سے بھی بھاگتے رہتے تھے۔ بول چال تک نہ تھی۔ وہی کرتار سنگھ آج اتنے شائستہ مزاج اور شفیق ہو گئے ہیں۔ اس پر دیا کرشن کو اتنی آسانی سے اعتبار نہ آسکتا تھا +

اُس نے پوچھا۔ مگر تمہارے چچا صاحب تو کبھی اتنے بڑے منتظم یا کارپرداز نہ تھے +

سنگار سنگھ نے عقیدت مندانہ انداز سے کہا۔ تمہارا خیال غلط ہے۔ پہلے وہ خانہ داری کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے تھے لیکن پاپا کے مرنے کے بعد ان کے مزاج میں ایک طرح کا انقلاب ہوگیا ہے۔ جتنے پرانے دغاباز ملازم تھے ان سبھوں کو نکال باہر کردیا۔

اوراب سارا کاروبار اُن کے انتظام میں خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ میرا ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ میں پانچ سو روپے ماہوار لیتا ہوں اور چین کرتا ہوں +

دیا کرشن نے اُس کا کمرہ دیکھا تو پہلے سے کہیں زیادہ آراستہ تھا۔ مخملی گدّوں کی کرسیاں اور صوفے، شیشہ آلات پیتل کے گملے، اعلیٰ درجے کے قالین کا فرش، کئی ملازم۔ جب وہ خود اس انتظام سے مطمئن ہے تو دیا کرشن کو خواہ مخواہ دخل دینے کا کیا حق تھا مگر کرتار سنگھ نے کوئی گہری سازش کر رکھی ہے اس خیال کو وہ دل سے نہ نکال سکا۔ اس نے پوچھا تو آج کل تمہارا کیا شغل رہتا ہے؟

سندگار سنگھ نے مسکرا کر کہا۔ وہی جو ہر ایک نوجوان کا ہونا چاہئے۔ یاروں کی مجلس، شراب کباب کے دور معشوقوں سے چھیڑ چھاڑ اور اس زندگی میں کیا رکھا ہے۔ میں تو عمر خیام کا ہم مشرب ہوں شراب کا پیالہ ہاتھ میں ہو معشوق بغل میں، اور کسی چیز کی تمنا نہیں۔ آج تمہیں بازار حُسن کی سیر کراؤں گا۔ تمہیں اس پنڈت پن کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔ اُس خشک زندگی کا تجربہ بہت کر چکے ذرا اس نفریب کوچہ کی بھی سیر کرو۔ بسم اللہ اسی وقت سے ہوگی +

یہ کہہ کر اُس نے گھنٹی بجائی۔ ایک وردی پوش کمسن لڑکا حاضر ہؤا۔ شراب کی فرمائش ہوئی اور ایک لمحہ میں سارا سامان میز پر آراستہ کر دیا گیا +

سندگار سنگھ نے ایک پیالہ میں شراب ڈالی اور دیا کرشن کی طرف پیالہ بڑھاتے ہوئے کہا، "یہ میرا جامِ صحت ہے" +

دیا کرشن کو کبھی شراب پینے کا اتفاق نہ ہؤا تھا۔ ایک تو ذات کا برہمن۔ اُس پر سادہ اور فطری معاشرت کا قائل۔ شراب کی بو ہی اُسے نفرت ہو رہی تھی۔ مگر نہ جانے کیا سوچ کر اُس نے جام منہ سے لگا لیا اور آنکھیں بند کر کے دارو ئے تلخ کی طرح دو گھونٹ پی گیا۔ سندگار نے سے گلے لگا کر کہا۔ جیتے رہو دوست، تمہاری دوست نوازی نے دل خوش کر دیا۔ بس میں ایسا ہی بے تکلف آدمی چاہتا ہوں یہ تمہارا جامِ صحت ہے +

اُس نے ایک پیالہ بھرا اور ایک ہی سانس میں غٹ غٹ پی گیا۔ تب ایک سگار جلاتا ہؤا بولا۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو شراب پینا گناہ سمجھتے ہیں، انگور کھانا گناہ نہیں ہے۔ مگر انگور کی شراب پینا گناہ ہے۔ اُس حماقت کی بھی کوئی حد ہے۔ میں پوچھتا ہوں دنیا میں شراب اور معشوق کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ آخر دولت کس مرض کی دوا ہے +

دیا کرشن نے دوبارہ گلاس منہ سے لگا کر کہا۔ مجھے تو بھئی اس کی لذت آج ہی ملی۔ دل کتنا ہی گرا ہؤا ہو، ایک گھونٹ پی اور تازگی آئی افسوس کہ اتنی عمر یونہی گزر گئی +

سندگار کی آنکھوں میں سُرخی آچلی تھی زبان میں لغزش کے ساتھ روانی پیدا ہو گئی تھی۔ دوسرا جام بھر کر بولا۔ دیا کرشن، تم واقعی شاعر ہو۔ تم نے چند الفاظ میں کتنی خوبصورتی سے اس کے سارے اوصاف کا خلاصہ بیان کر دیا۔ مانتا ہوں دل کو تازہ کرنے کا یہی ایک نسخہ ہے۔ اسی بوتل کے اندر وہ آبِ حیات ہے جس کا ایک گھونٹ مُردے کو بھی زندہ کر دیتا ہے (گاتا ہے)

ساقی مئے صاف، ارغوانی لانا   کم جس سے ہو کچھ غمِ نہانی لانا

ترسی ہوئی مدتوں سے ہے روحِ فرداں — سرچشمۂ بادۂ جوانی لانا

بھئی پیالہ جلد خالی کرو۔ دوسرا دور شروع ہو گیا۔ افسوس کہ اس وقت یہاں مادھری نہیں۔ واللہ اس کی صورت دیکھ کر فنا ہو جاؤ گے، فنا ہو جاؤ گے۔ سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ میں تو بھئی اس بتِ طناز پر فدا ہوں، اگر زندگی میں کوئی تمنا ہے تو بس یہی کہ اس کے قدموں پر سر رکھ کر اِس دنیا سے گزر جاؤں۔ دنیا چند روزہ ہے بھائی بالکل نقش بر آب۔ اس میں دل لگانا حماقت ہی سراسر حماقت۔

اِک تری لو لگائے بیٹھے ہیں — اور سب کچھ بھلائے بیٹھے ہیں

تیری محفل میں تیرے پروانے — شمعِ ہستی بجھائے بیٹھے ہیں

کئی منٹ تک سنگار سنگھ پر یہی عالمِ کیف طاری رہا۔ اشعار پڑھتا اُن کی توضیح و تشریح کرتا۔ دنیائے بے ثبات کے نام کو روتا۔ یہاں تک کہ اس کا سر جھک گیا اور وہ میز پر سر رکھ کر مدہوش ہو گیا۔

(۳)

اُسی وقت عقب کا پردہ کھلا اور لیلا نے اشارے سے دیا کرشن کو اندر بلایا۔ وہ نازنین جسے دیکھ کر آنکھوں میں طراوت آ جاتی تھی اُس پر اُس وقت حسرت چھائی ہوئی تھی گویا ابھی رو کر اٹھی ہو۔ دیا کرشن نے اندر جا کر فرقِ نیاز خم کیا۔

لیلا نے اسے شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ سمجھی تھی تم آ کر زخم پر مرہم رکھو گے، مگر تم نے بھی وہی مشقِ ستم شروع کی۔

دیا کرشن نے مسکرا کر کہا۔ مفت کی قاضی کو بھی حلال ہے لیلا!

لیلا چیں بہ جبیں ہو کر بولی۔ کیا بے حیاؤں کی سی باتیں کرتے ہو جی۔ مفت کی قاضی کو بھی حلال ہے۔ یہ مفت کی شراب نہیں ہے، تمہارے اس دوست کا خونِ جگر ہے اور میری آنکھوں کے آنسو۔ اس کا ایک ایک گھونٹ ان کو اور ان کے ساتھ مجھ کو جہنم کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ اب تک اسی امید سے دل کو تسکین دیتی تھی کہ تم آ کر انہیں راہِ راست پر لاؤ گے۔ اب وہ امید بھی غائب ہوئی۔ پیر خود ماندے، علاج کیا کریں گے!

دیا کرشن ذرا بھی خفیف نہ ہوا۔ اسی سنجیدہ لطف آمیز لہجہ میں بولا۔ تمہیں یقین ہے کہ میں انہیں راہِ راست پر لا سکتا ہوں؟

"اگر تم نہیں لا سکتے تو ان کی بہار بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اگر اسی شہر میں بھیک نہ مانگتے پھریں تو مجھے کوسنا۔"

"آخر تم مجھ سے کیوں ایسی امید رکھتی ہو؟ ان کے اور احباب بھی تو ہیں۔ مجھی میں کوئی خصوصیت ہے؟"

"ہاں ہے؟ میں تمہیں ان کا دوست سمجھتی ہوں۔ یا سمجھتی تھی۔ اوروں کو میں ان کا دشمن سمجھتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہ مجھ سے مت پوچھو دیا کرشن۔ تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا اور میرا بے انتہا نقصان۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ مجھے تم پر اعتبار تھا اور یہ تماشا دیکھ کر بھی وہ اعتبار دل سے اٹھانا نہیں چاہتا۔

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دیاکرشن کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں کوئی نغمہ گونج اٹھا۔ اس نے مخمور نظروں سے دیکھ کر کہا "تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں لیلا کہ تمہیں اُس اعتبار کے لئے پچھتانا نہ پڑے گا۔ تمہارے لئے میں اپنے ضمیر کا خون کرنے میں بھی دریغ نہ کروں گا +

یہ کہتا ہؤا وہ جلدی سے باہر نکل آیا اور گھر کی طرف چلا، اتنا خوش گویا اس کی زندگی کی ساری آرزوئیں پوری ہو گئی ہیں۔ اس کے قدموں پر گر کر اُس کی پرستش کرنے سے وہ اپنے کو بمشکل روک سکا۔ دنیا میں اس کی زندگی کا شکم پروری کے سوا کوئی دوسرا مصرف ہے، یہ خیال اُس کے تاریک خانۂ دل میں ایک شمع کی طرح روشن ہو گیا تھا۔ خاک میں پڑا ہؤا پھول آج دیوتا کے قدموں پر چڑھا دیا گیا تھا +

(۴)

ایک مہینہ گزر گیا۔ دیاکرشن جیسے سلیم المزاج اور فقیر منش نوجوان کی شوریدہ سری پر اپنے پرائے سبھی انگشتِ بدنداں تھے۔ سنگار سنگھ کے گھر میں دولت تھی۔ تھوڑی سی رنگین مزاجی اس کے لئے قابلِ معافی ہی نہیں، اس کی زیبائش تھی۔ امرا کی دولت آخر اور کس کام آئے۔ احباب کی بذلہ سنجی اور حسینوں کے حسن کے قدرداں اگر یہ نہ ہوں تو کون ہو۔ لیکن دیاکرشن جو لنگوٹی میں پھاگ کھیل رہا ہے اُسے کون معاف کر سکتا ہے۔ برسوں کی عرق ریزی کے بعد کلکتہ میں جو چھوٹا سا کاروبار جما پایا تھا وہ تباہ ہو گیا تھا اور شاید اپنا مکان بھی رہن رکھ چکا تھا۔ ملنے والے سمجھاتے ہیں، نشیب و فراز سُجھاتے ہیں۔ مگر اُس کی آنکھوں پر کچھ ایسا پردہ پڑ گیا ہے کہ کسی طرح نہیں اٹھتا +

سنگار سنگھ سے اب اس کی دوستی نہیں رقابت ہے۔ دونوں ایک ہی صنم کے پجاری ہیں۔ مادھری کے زاہد فریب حسن نے دیاکرشن کو بھی اپنا دیوانہ بنا لیا ہے۔ سنگار سنگھ متکبر ہے، دیاکرشن حد درجہ منکسر، سنگار کی نظروں میں مادھری محض شوق کی ایک چیز ہے، محض تفریح کا ایک آلہ، دیاکرشن مادھری کا خادم ہے، محض اُس کے ایک تبسم کا بھوکا۔ سنگار مادھری کے التفات کو اپنا زرِ خرید حق سمجھتا ہے۔ دیاکرشن اسی میں خوش ہے کہ مادھری اس کی خدمتوں کو قبول کرتی ہے۔ مادھری کی جانب سے ذرا بھی بے اعتنائی دیکھ کر سنگار سنگھ اسی طرح غضبناک ہو جایا کرتا جیسے اپنی عزیز گھوڑی کی شرارت پر۔ دیاکرشن اپنے کو التفات کا مستحق ہی نہیں سمجھتا۔ سنگار جو کچھ مادھری کی نذر کرتا ہے ایک خودنمائی کی شان کے ساتھ۔ جیسے اس پر کوئی احسان کر رہا ہو۔ دیاکرشن اس سے زیادہ بیش بہا تحفے پیش کرتا ہے پر اس طرح جیسے دیوتا کو پھول چڑھاتا ہو۔ سنگار کا حریص نفس مادھری کو اپنے قفس میں بند رکھنا چاہتا ہے۔ دیاکرشن کا وسیع دل اس کے فروغ پر خوش ہوتا ہے۔ مادھری کو اب تک جتنے آدمیوں سے سابقہ پڑا تھا وہ سب سنگار ہی کی طرح نفس پرور، حاسد، خود پسند، نازک جذبات سے عاری تھے، حسن کو نشاط کی جنس سمجھنے والے۔ دیاکرشن ان سبھوں سے الگ تھا، پہلو میں دل رکھنے والا، بے نفس جس کے لئے حسن پرستش کی چیز تھی۔ مادھری کو اب اپنی زندگی میں کوئی ایسی چیز مل گئی ہے جسے وہ بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھنا چاہتی ہے۔ جڑاؤ گہنے اب اس کی نظروں میں اتنے قابلِ قدر نہیں ہیں جتنا یہ فقیر کا دیا ہؤا تعویذ۔ جڑاؤ گہنے

ہمیشہ ملیں گے۔ یہ تعویذ کھو گیا تو پھر شاید ہی ملے۔ جڑاؤ گہنے محض اس کے شوق خودنمائی کو خوش کرتے ہیں۔ پر اس تعویذ میں تو روحانی تاثیر ہے جو نہ معلوم کیسے اس میں عقیدت اور خلوص پیدا کر دیتی ہے۔ دیا کرشن اظہارِ محبت نہیں کرتا۔ اپنی دیوانگیٔ عشق کے راگ نہیں الاپتا، لیکن مادھری کو اس پر کامل اعتبار ہے۔ سنگار کی صحبت میں اسے تصنع کا احساس ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہے یہ جلد یہاں سے جائے۔ سنگار کا اظہار اس کے اوچھلے پن کا، اس کی کم ظرفی کا پردہ فاش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن دیا کرشن کی خموشی میں اسے گہرائی اور گرانی کا احساس ہوتا ہی۔ اس کی صحبت سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی اوروں کی وہ معشوق ہے لیکن دیا کرشن کی عاشق جس کے قدموں کی آہٹ پاکر اس کے دل میں ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے، اُس کی زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ اب تک وہ دوسروں کے حظِ نفس کی چیز تھی۔ اب کم سے کم ایک آدمی کی نگاہ میں وہ عزت اور اعتبار کی چیز ہے۔ جو اس کے لئے قربانیاں کرسکتا ہے، جان دے سکتا ہے +

سنگار سنگھ کے دل میں حسد کی آگ دہک رہی ہے۔ اُس نے دیا کرشن کے پیچھے کئی شہدے لگا رکھے ہیں کہ اُسے جہاں پائیں ذلیل کریں اگر موقع ملے تو اُس کی مرمت بھی کریں۔ وہ خود پستول لئے اُس کی تلاش میں رہتا ہے۔ دیا کرشن یا تو اس خطرے سے بے خبر ہے یا اُسے اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے۔ وہ اپنے معین وقت پر مادھری کے پاس آجاتا ہے۔ شہدے اسے دیکھ کر بھی کترا کر نکل جاتے ہیں موقع پاکر بھی کیوں اُس پر وار نہیں کرتے اس کا راز وہ کیا سمجھے +

ایک دن مادھری نے اُس سے کہا "کرشن جی، تم یہاں نہ آیا کرو تمہیں تو خبر نہیں ہے، یہاں تمہارے بیسیوں دشمن ہیں میں ڈرتی ہوں کہ کسی دن کوئی حادثہ نہ ہو جائے"+

دیا کرشن نے مطمئن انداز سے جواب دیا "میں تو کسی کی برائی نہیں کرتا۔ کوئی میرا دشمن کیوں ہو۔ میں یہاں آنے سے اپنے کو روک نہیں سکتا۔ داتا کے دروازے پر صدہا سائل آتے ہیں اپنی اپنی تقدیر ہے۔ کسی کو اس سے زیادہ فیض پہنچتا ہے کسی کو کم۔ تم اگر کسی سے زیادہ مانوس ہو تو میں اُسے خوش نصیب سمجھ کر اُس کی عزت کروں گا۔ جلنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن تم مجھے یہاں آنے سے روک نہیں سکتیں سائل ٹھکرایا جاسکتا ہے۔ روکا نہیں جاسکتا"+

مادھری رحم کی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ایک لمحہ کے بعد بولی "کیا سب آدمی تمہارے ہی جیسے صاف دل ہیں"؟

"تو پھر میرا کیا اختیار ہے"؟

"ایک بات کہوں چلو ہم تم کسی دوسرے شہر میں جا بسیں"۔

"محض اس خوف سے کہ کچھ لوگ مجھ سے بدظن ہیں"

"بدظن نہیں ہیں۔ تمہارے دشمنوں کے قتل پر آمادہ ہیں"۔

دیا کرشن اسی مطمئن انداز سے بولا "جس دن تمہاری محبت کا یہ صلہ ملے گا وہ میری نئی زندگی کا دن ہوگا۔ تب میں تم سے باہر نہ رہ کر تمہارے خیال میں، تمہارے دل میں رہوں گا"+

مادھری نے نازک ہاتھوں سے اُس کے گال پر تھپکی دی۔ اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ان الفاظ میں جو پیار بھرا ہوا تھا وہ جیسے

پچکاری کی دھار کی طرح اس کے دل میں سما گیا۔ ایسی سراسیمگی! ایسا نشہ! اسے وہ کیا کہے۔ درد میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں بولی "ایسی دل سوز باتیں نہ کیا کرو کرشن، نہیں میں سچ کہتی ہوں ایک دن زہر کھا کر تمہارے قدموں پر سو جاؤں گی۔ تمہارے ان الفاظ میں نہ جانے کیا جادو تھا۔ میں جیسے پھنک اٹھی۔ اب آپ خدا کے لئے یہاں تشریف نہ لایا کیجئے۔ تم کیا جانو ظالم سنگار کس بری طرح تمہارے پیچھے پڑا ہؤا ہے۔ میں اُس کے شہدوں کی خوشامد کرتے کرتے ہار گئی۔ کتنا کہتی ہوں دیا کرشن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سنگار کے سامنے تمہیں برا بھلا کہتی ہوں تمہارا مذاق اڑاتی ہوں لیکن اسے مجھ پر اعتبار نہیں آتا۔ تمہارے لئے میں نے قاتلوں کی منتیں کی ہیں، ان کی کتنی بے جا فرمائشیں پوری کی ہیں، تم سے نہ کہنا ہی اچھا ہے جن سی باتیں کرنی بھی میں اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہوں اُن کے پیروں گری ہوں، لیکن یہ کُتّے ہڈیوں کے ریزے پا کر اور بھی شیر ہوتے جاتے ہیں۔ اب میں اُن سے تنگ آ گئی ہوں اور تم سے منت کرتی ہوں کہ یہاں سے کسی ایسی جگہ چلے چلو جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو۔ وہاں آرام سے زندگی بسر کریں۔ آج بغیر اس کا تصفیہ کرائے میں تمہیں یہاں سے نہ جانے دوں گی"

دفعتہً نیچے زینے پر ہلچل سنائی دی۔ پھر دھڑ سے دروازہ بند ہو گیا اور نیچے سے آدمی دوڑتا ہؤا آ کر بولا "بائی جی، سردار صاحب آئے ہیں اور اوپر آنے کے لئے ضد کر رہے ہیں۔ تمہارے حکم کے مطابق میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے"

مادھری کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ گھبرا کر بولی "اکیلے ہیں یا ساتھ اور آدمی ہیں؟"

"نہیں دو آدمی اور لاٹھیاں لئے کھڑے ہیں"

مادھری نے سر پر ہاتھ مار کر کہا "یہ شیطان اس وقت کیا کرنے آیا۔ یہ تو اس کے آنے کا وقت نہ تھا۔ ضرور کسی مخبر نے خبر دے دی"

نیچے سے کسی نے زور زور سے دروازے کو کھڑکھڑانا شروع کیا۔ مادھری زینہ کی طرف دوڑی۔ اس وحشت میں عورت کا نازک دل اس کے چہرے پر آ کر بیکس طائر کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا معلوم ہؤا۔ زینے کی طرف دو قدم جا کر وہ پھر لوٹ پڑی اور کھڑکی کے پاس جا کر نیچے دیکھ کر بولی۔ کیا ہے جی، کیوں دروازہ توڑے ڈالتے ہو؟"

سنگار نے خونبار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "خیریت اسی میں ہے کہ دروازہ کھول دو۔ دیا کرشن اوپر بیٹھا ہؤا ہے۔ آج اُس کی اور تمہاری دونوں کی مزاج پرسی کروں گا"

دیا کرشن نے سر نکال کر کہا "تو شوق سے آؤ میں تیار ہوں"

مادھری نے چھاتی پیٹ کر کہا "یہ کیا غضب کرتے ہو کرشن۔ ہائے کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، مجھے اُس کی دولت نہ چاہئے۔ اُس کے تحفے نہ چاہئیں۔ میرے لئے تو دنیا میں تم اور صرف تم ہو"

دھماکے کی آواز ہوئی۔ شکستہ لاٹھیوں کی چوٹیں نہ سہہ سکی۔ زینے کے دونوں کواڑ کھل گئے اور سنگار اپنے دونوں غنڈوں کے ساتھ دھم دھم کرتا ہؤا اوپر چڑھ آیا اور قبل اس کے کہ مادھری کچھ کہہ سکے تینوں آدمی دیا کرشن پر ٹوٹ پڑے اور اُسے ٹھوکروں اور لاٹھی کے کندوں سے مارنے لگے۔ مادھری بار بار اُسے بچانے کے لئے لپکتی تھی پر یہ شیطان اُسے بار بار دھکے دے کر ہٹا دیتے تھے۔ اُس کی ساری چوڑیاں ٹوٹ گئیں، مہین ریشمی ساڑھی کئی جگہ سے مسک گئی زلفیں کھل گئیں۔ ہونٹ خشک ہو گئے مگر ان ظالموں کو نہ اس پر رحم آتا تھا اور نہ دیا کرشن

پر۔ آخر جب وہ بیدم ہوگیا اور خون جاری ہونے سے اُس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی تب سنگار نے کہا اب جانے دو نہیں مرجائے گا۔ بچہ کو کافی سبق مل گیا۔ کچھ دنوں یاد رہے گا"

مادھری نے آنکھوں میں آنسو بھرے خون کا گھونٹ پی کر کہا "نہیں نہیں کام تمام کردو شاید ابھی کچھ جان باقی ہو۔ اتنی کسر کیوں رکھتے ہو۔ لیکن آج میں اس راز کو کھولے دیتی ہوں جسے میں نے اب تک چھپایا تھا۔ کرشنا میرا ہے اور میں کرشنا کی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ بازاری عورت کے سینہ میں بھی دل ہوتا ہے اور اس دل میں بھی محبت ہوتی ہے، اسے ثابت کرنے کا تم نے مجھے موقع دے دیا اس کے لئے میں تمہاری مشکور ہوں۔ اس کی زندگی میں میری محبت غرض سے خالی نہ ہوسکتی تھی۔ میں شاید محبت کے عوض محبت کی خواستگار رہتی اب میری محبت غرض سے پاک ہوگی۔ وہ محبت کا دیوتا تھا، اُس محبت کا جو کوئی عوض نہیں چاہتی، محض قربان ہونا چاہتی ہے۔ تم مجھے دولت سے خریدنا چاہتے تھے۔ اس نے مجھے اپنی محبت سے خریدا جس پر آج میں تمہاری ساری دولت نثار کردوں گی"

سنگار سنگھ کے سینے میں جلتی ہوئی دھات کی ایک لہر گھسی اور اس کے دل و دماغ کو چھن چھن جلاتی ہوئی اوپر نکل گئی وہ اس طرح دو قدم پیچھے ہٹ گیا گویا کسی ناگن نے پھنکارا ہو۔ مادھری نے اب تک اسے سبز باغ دکھایا تھا۔ ہمیشہ دیا کرشن کی بدگوئیاں کرتی رہتی تھی۔ اس سے سنگار سنگھ سمجھتا تھا دیا کرشن محض ضد سے یہاں آتا ہے۔ مادھری اس سے التفات نہیں کرتی۔ آج اس کی نظروں سے پردہ ہٹ گیا۔ اسے معلوم ہوا جسے اس نے وفا کی دیوی سمجھ رکھا تھا وہ زہریلی ناگن ہے۔ اس کی ساری دیوانگی، سارا محبت کا نشہ، ایک قاتل نفرت میں تبدیل ہوگیا۔ زندگی میں ایسی شکست اسے پہلی بار ملی، اور ایک حقیر دشمن کے مقابلہ میں ہونٹ چبا کر بولا۔ "اب مجھے اپنی حرکت پر مطلق افسوس نہیں ہے۔ تم اسی برتاؤ کے قابل تھیں۔ میری ساری جاں نثاریوں کا یہی صلہ تھا جو تم نے مجھے دیا! عورت کتنی بے وفا ہے اس کا تم نے مجھے سبق دے دیا۔ کیا ستم ہے کہ جس پر میں اپنی جان تک نثار کرنے کو تیار تھا وہ یوں دغا کرے"

مادھری اپنا رومال تر کر کے دیا کرشن کا منہ دھو رہی تھی۔ تڑپ کر بولی۔ "کیا فضول بکتے ہو۔ تم جیسے نفس کے بندے جاں نثار نہیں ہوسکتے۔ تم میرے پاس تفریح کے لئے آتے تھے اور میں تمہاری تفریح کرتی تھی۔ تم میری صورت کے میری اداؤں کے خریدار تھے میں نے وہ چیزیں تمہیں دیں۔ پیسوں سے تم عورت کا دل نہیں خرید سکتے۔ تمہاری ساری جائداد اُس کے پاسنگ بھی نہیں۔ دل صرف دل سے ملتا ہے صرف دل سے، نہ عورت سے محبت کی اصلی اور نقلی صورت چھپی رہ سکتی ہے۔ اب اللہ جاؤ اور مجھے اپنی تقدیر پر رونے دو۔ میں اسی وقت تمہیں پولیس کے سپرد کرسکتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ کرشنا کبھی اسے پسند نہ کرے گا"

سنگار نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا "تم نے میرے ساتھ بے وفائی کیوں کی؟"

مادھری نے اسی لہجہ میں جواب دیا "اگر تم نے اپنے کو میرے ہاتھ نہیں بیچا تو میں نے بھی اپنے کو تمہارے ہاتھ نہیں بیچا۔ جس طرح تم آزاد ہو اُسی طرح میں بھی آزاد ہوں۔ تم قسم کھا سکتے ہو کہ اس دوران میں تمہارا کسی اور سے تعلق نہیں رہا؟"

سنگار دم بخود کھڑا رہ گیا! اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ یہ قسم وہ نہ کھا سکتا تھا۔ ایک لمحہ تک وہ دل میں انتقام کے منصوبے سوچتا رہا۔ تب آہستہ آہستہ زینہ سے اتر گیا۔ اس کے غضب ناک چہرے پر خفت کا شوخ رنگ جھلک رہا تھا جیسے اُس کی ساری

پونجی بازار میں لٹ گئی ہو۔ مادھری نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا +

(۵)

رات کو سنگار سنگھ کی محفل نہ جمی۔ احباب مبارکباد پیش کرنے آئے مگر سنگار سنگھ کی طبیعت مضمحل تھی۔ وہ کسی سے نہ مل سکا۔ اپنی خلوت گاہ میں بیٹھا ہوا ایک پرنگ پی رہا تھا پر اندر کی آگ نہ فرد ہوتی تھی۔ اس شعلہ نے نہ جانے کتنے خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیا تھا، اور اب اوپر کی سطح سے گزر کر ایک حیات بخش حرارت کی صورت اختیار کر کے ندامت اور غیرت کے افسردہ اور نہ تسکین جذبات میں حرکت اور ہیجان پیدا کر رہا تھا۔ مادھری کی بے وفائی نے اس کے الھڑ اور نشاط پسند دل کو کچھ ایسا مجروح کر دیا تھا کہ اب ہمدردی کی آواز بھی اس کے زخم پر نمک سا چھڑک رہی تھی۔ مادھری اُس کی زندگی کی دلفریب ترین حقیقت تھی۔ اس کی زندگی کے سارے خطوط اسی مرکز پر مجتمع ہوتے تھے، وہ مرکز آج یکایک حباب کی طرح مٹ گیا اور اب وہ سارے خطوط، وہ ساری دلچسپیاں، وہ ساری کیفیتیں اُن تند اور غضبناک مکھیوں کی طرح بھنبھناتی پھرتی تھیں جن کا چھتہ شہد سے بھرا ہوا جلا دیا گیا ہو۔ جب مادھری نے بے وفائی کی تو اور کس سے وفا اور خلوص کی امید کی جائے۔ مادھری کے وہ دل آزار الفاظ رہ رہ کر اس کے جگر میں کسک پیدا کر رہے تھے۔ اس ویران زندگی کو لے کر اب وہ کیا کرے +

تین دن گزر گئے تھے۔ لیلا کو یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ ان دنوں میں محفل سُونی کیوں ہے۔ وہ احباب کہاں گئے جو صبح ہوتے ہی سوار ہو جاتے تھے اور آدھی رات کے قبل ٹلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ کہیں سنگار سنگھ کی طبیعت ناساز تو نہیں ہے؟ اس نے سنگار سنگھ کے کسی معاملے میں دخل دینا ترک کر دیا تھا۔ اسے اس گھر سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ باہر کی جو کچھ فرمائش ہوتی تھی اس کی بے عذر تعمیل کو اس نے اپنی عادت بنا لیا تھا، نہ کسی شوق سے واسطہ تھا نہ آرائش سے۔ کوئی زاہد بھی شاید اس بے رحمی سے اپنے نفس کو پامال نہ کرتا۔ مگر آج اس اندیشہ نے اس کے زاہدانہ جمود میں حس پیدا کر دی۔ شادی کے بعد کچھ دنوں اس نے محبت کا مزا چکھا تھا۔ وہ پھول مرجھا گیا تھا لیکن سوکھی ہوئی پتیوں میں ابھی خوشبو باقی تھی۔ اس پھول کی خوشبو میں، اس محبت کی یاد میں اب بھی دل کو دردناک مسرت حاصل ہوتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سنگار کی خلوت گاہ کے دروازے تک آئی اور کان لگا کر سنتی رہی۔ پر کوئی آہٹ نہ پا کر اس نے پردہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ دیکھا سنگار سنگھ صوفے پر کہنی کے بل بے حس و حرکت لیٹا ہوا ہے جیسے کوئی درخت شام کے سکوت میں اپنی پتیوں کو سمیٹے ہوئے ہو۔

اس نے کمرے میں جا کر پوچھا "میری زبان پر تو قفل ڈال دیا گیا ہے لیکن کیا کروں، بغیر بولے نہیں رہا جاتا۔ کئی دن سے حضور کی محفل میں سناٹا کیوں ہے؟"

سنگار سنگھ نے آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں ناقابل بیان درد بھرا ہوا تھا۔ حسرت ناک لہجہ میں بولا "تم اپنے میکے کیوں نہیں چلی جاتیں لیلا؟"

لیلا نے خود دارانہ انداز سے کہا "آپ کا جو ارشاد ہو گا اُس کی تعمیل میرا فرض ہے۔ مگر یہ تو میرے سوال کا جواب نہ تھا"

"وہ کوئی بات نہیں۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ مگر اب اس زندگی سے سیر ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھاؤں

تم اپنے گھر چلی جاؤ تو مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو جائے"

"شکر ہے آپ کو میری اتنی فکر تو ہے۔ جب کہئے چلی جاؤں میری وجہ سے آپ کے اطمینان میں خلل پڑے میرے لئے اس سے زیادہ بدنصیبی اور کیا ہو گی؟"

"تو تم اپنی تیاریاں کر لو۔ میں تمہیں خود پہنچا دوں گا۔ اُدھر ہی سے چلا جاؤں گا"

"مجھے کوئی تیاری نہیں کرنی ہے اور نہ آپ کو میرے ساتھ جانے کی ضرورت ہے۔ کسی نوکر کو ساتھ لے لوں گی"

"میں ناراض ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں لیلا تم جو جو چیزیں چاہو لیتی جاؤ تمہیں یہاں سے ماہوار خرچ ملتا رہے گا"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں نے بہت دنوں سے اس گھر کی چیزوں کو اپنا سمجھنا چھوڑ دیا۔ اب تک آپ کی روٹیاں کھاتی تھی۔ آپ کو یہ بھی گراں گزر رہا ہے تو وہ بھی چھوڑ دوں گی"

سنگار سنگھ نے لیلا کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا اور التجا کی نظروں سے دیکھ کر بولا "ایشور کے لئے جلاؤ مت لیلا" مجھے اس وقت تمہارے رحم اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ دغا اور بے وفائیوں نے سینہ کو چھلنی کر دیا ہے۔ اُس پر چھریاں نہ چلاؤ میں جانتا ہوں مجھے تم سے کوئی التجا کرنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم میری التجا کو رد نہ کرو گی۔ اس دنیا سے جی بیزار ہو گیا۔ یہاں اپنے عزیز ترین دوست، جن کے لئے ہم مرنے کو آمادہ ہوتے ہیں، موقع پا کر گردن کاٹتے ہیں ایسی زندگی پر اور ایسے آدمیوں پر لعنت ہے۔ دیا کرشن کو تم جانتی ہو۔ اسی گھر کے ٹکڑوں پر پلا، اسی گھر سے آدمی بنا، مگر آج وہ میرا جانی دشمن ہے"

سنگار یہ کہتا کہتا رک گیا۔ لیلا اُس کے منہ کی طرف تکتی رہی، اُسے ایسا معلوم ہوا وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ دو ایک بار الفاظ اُس کے لبوں تک آتے ہوئے معلوم ہوئے۔ لیکن باہر نہ نکل سکے

آخر لیلا نے پوچھا۔ "دیا کرشن تو ایسا آدمی نہیں ہے ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہو گی"

سنگار نے تند ہو کر کہا۔ "کوئی وجہ نہیں۔ محض اُس کی بدمعاشی ہے"

"میں اسے نہیں مانتی"

"وہ مجھے ذلیل اور بدنام کرنا چاہتا ہے"

"آخر کیوں؟"

"یہ اُسی سے پوچھو۔ مگر میں نے بھی اُن کی ایسی مرمت کر دی ہے کہ شاید پھر کبھی میرے راستے میں نہ کھڑے ہوں"

لیلا نے اسے نگاہِ ملامت سے دیکھا۔ اُس کی آواز میں لغزش تھی

"تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی؟"

سنگار نے اپنی صفائی دی۔ "کام تو حضرت نے وہ کیا ہے کہ میں انہیں قتل کر دینے میں بھی حق بجانب تھا لیکن میں نے طرح دی۔ اب آپ کو عشق کا شوق چرایا ہے۔ جب اس کوچہ سے رسوا ہو کر نکلیں گے تب ہوش آئے گا میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں خود ہی تباہ ہوں گے جو کچھ

لیٹی ہوئی تھی وہ نکل چکی ہوگی۔ اب بے شرمی کی روٹیاں توڑنی پڑیں گی۔ میں تو کبھی کبھی افسوس کرتا ہوں کہ ناحق اُس کے پیچھے پڑا۔ اُس نے تو ایک طرح سے مجھے ہشیار کردیا۔ ایک طرح سے نہیں قطعی طور پر ہشیار کردیا۔ تم سے کیا چھپاؤں لیلا! میں نے تمہارے ساتھ دغا کی ہے۔ بیوفائی کی ہے۔ بیرحمی کی ہے۔ اب میرا منہ نہیں ہے کہ تم سے ہمدردی کی التجا کروں۔ میری غلطیوں کو معاف کرنا۔ میں تو کہیں کا نہ رہا۔ میری حالت تو بجنسہٖ اُس آدمی کی سی ہے جو ایک کانچ کے ٹکڑے کو پاکر ہیرا سمجھ بیٹھے اور اسی نشہ میں اپنا گھر جلا دے کہ اب تو وہ اپنے لئے محل بنوائے گا۔ اب تو میرے لئے اس کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے کہ منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں یا کہیں ڈوب مروں +

اُس نے پھر لیلا کی طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں شکست تھی، التجا تھی، درد تھا۔

(۶)

ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ سندگار سنگھ اور لیلا اپنے باغیچہ میں حوض کے کنارے ہری گھاس پر بیٹھے ٹھنڈی ہوا کا لُطف اٹھا رہے ہیں کہ دیاکرشن باغ کا پھاٹک کھول کر مسکراتا ہوا اندر آیا اور سندگار کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا "اب تو تم نے میرا قصور معاف کر دیا ہوگا" سندگار سنگھ اضطراری جوش میں اٹھ کر اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔ ندامت اور افسوس کے آنسو اُس کی آنکھوں میں ڈبڈبا آئے۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا +

لیلا نے دیکھا دیاکرشن بہت لاغر ہوگیا ہے اور اُس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے مگر بشاش ہے۔ ترچھی نظروں سے دیکھ کر بولی "کیا ابھی کچھ کمزوری باقی ہے"؟

دیاکرشن نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا "آپ سے مطلب؟ آپ نے تو سمجھ لیا اچھا ہوا مر رہا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔ مگر میری زندگی باقی تھی۔ بچ گیا۔ بھول کر بھی تو ایک بار دیکھ لیتیں کہ مرا یا جیتا ہے +

لیلا نے شرارت آمیز تبسم سے کہا "میں آپ کی نئی نویلی محبت کی دلچسپیوں میں کیوں مخل ہوتی۔ انہیں سمجھانے آئے تھے اور خود اُس کی اداؤں کا شکار ہوگئے۔ سچ کہا ہے مردوں کا کوئی اعتبار نہیں" +

دیاکرشن قہقہہ مار کر ہنسا۔ پھر بولا "میری فکر نہ کرو۔ میں شکار ہوگیا یا مر گیا اس کا غم نہیں۔ تم دونوں کو آج یہاں یکجا بیٹھے دیکھ کر مجھے اپنی ساری تکلیفوں کا معاوضہ مل گیا۔ مادھری تو محض گھاتے میں ملی۔ کل ہماری شادی ہے تمہیں دعوت دینے آیا ہوں" +

لیلا حیرت سے اُس کے منہ کی طرف تکنے لگی اور سندگار "بڑے بدمعاش ہو، بڑے شیطان ہو" کہہ کر اُسے بار بار پیار کرنے لگا +

پریم چند

شعر گوئی

[illegible]

جذباتِ اعجاز

یہ مرزا اعجاز حسین مرحوم کی آخری غزل ہے جو انہوں نے ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے لئے بھیجی تھی۔ اُن کا جو خط غزل کے ساتھ آیا تھا اس کا ترجمہ بھی ذیل میں بطورِ تبرک درج کیا جاتا ہے:-

عزیز مکرم میاں بشیر احمد صاحب

السلام علیکم۔ میں آج ایک غزل بھیج رہا ہوں۔ مدت ہوئی جب میں نے وعدہ کیا تھا کہ ہمایوں کے لئے کچھ بھیجوں گا لیکن خرابیٔ صحت اب تک مانع رہی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ آپ نے مجھے میرے کچھ شعر ہارمونیم کے ساتھ گا کر سنائے تھے اور آپ کی مہارتِ فن نے ان اشعار میں روح پھونک دی تھی۔ اگر موجودہ غزل میں سے آپ نے کوئی شعر پسند کیا تو میری کوششوں کا یہی صلہ کافی ہوگا کہ آپ کی قدرتِ فن ایک دفعہ پھر ان بے جان خیالات میں جان ڈال دے۔

آپ کا مخلص

اعجاز حسین

دہلی۔ ۱۸ر اگست ۱۹۳۲ء

خوشی سے دن گزار اپنا شبِ آلام آنے تک — ذرا کھٹکا نہ رکھ انجام کا انجام آنے تک

یہ مانا ہاتھ میں ساغر ہے لیکن کیا بھروسا ہے — ہزاروں لغزشیں حائل ہیں لب تک جام آنے تک

مکافاتِ عمل میں دیر بھی اب تو نہیں لگتی — کرو جو صبح بدلہ مل رہے گا شام آنے تک

تکلف کیا تمہاری آنکھ بھی تو شیشۂ مے ہے — اسی شیشے سے کچھ دے دو مے گلفام آنے تک

بڑے دعوے سے مے خانہ چلے ہیں حضرتِ واعظ — بڑی رونق رہے گی آپ کے ناکام آنے تک

چلا آتا ہی دورِ مے مگر دل میں یہ دھڑکا ہے — نظر ساقی کی پھر جائے نہ مجھ تک جام آنے تک

بتا دو تم ذرا خود ہی کہ کتنے سال گزریں گے — تمہاری صبح ہونے تک تمہاری شام آنے تک

یہی غفلت شعاری ہے تو تم کام آ چکے اپنے — کہ اپنا کام ہولے گا تمہارے کام آنے تک

کبھی تو یاد فرمائیں گے اے اعجاز مت گھبرا
گزر ہی جائے گی سرکار کا پیغام آنے تک

شاعر اور لالۂ صحرا

شاعر

"لالۂ صحرا! بیاباں میں کھلا تھا کس لئے؟
یعنی تو رونق فزا بن میں ہُوا تھا کس لئے؟

آہ تجھ کو دیکھنے والا نہیں بن میں کوئی
آہ تیرا والہ و شیدا نہیں بن میں کوئی

بُلبلیں تجھ پر نہ گائیں گی نہ گائیں گی کبھی
قُمریاں کُو کُو کہاں تجھ کو سنائیں گی کبھی

باغ کے طائر نہ تجھ پر پھڑ پھڑائیں گے یہاں
شہد کے ماتے نہ آکر بھنبھنائیں گے یہاں

موتیا کی کب میسر ہے یہاں ہمسائگی
نسترن کی شاخ جُھک کر تجھ تلک کب آئے گی

باغ کے پودے نہ بن میں لہلہائیں گے کبھی
دیکھ کر تجھ کو نہ غنچے مُسکرائیں گے کبھی

رات شبنم رو رہی تھی بے کسی یہ دیکھ کر!
جل رہا ہے مہرِ تاباں زندگی یہ دیکھ کر!"

لالۂ صحرا

"واہ وا کی آرزو مجھ کو بیاباں میں نہیں
اس کا غم مجھ کو نہیں گر میں گلستاں میں نہیں

خود مری ہستی ہے مجھ کو رونقِ صد گلستاں
بن کی یہ بستی ہے مجھ کو خلد زارِ آسماں

آپ ہی اپنی حقیقت جاننا بس ہے مجھے
آپ اپنی خوبیاں پہچاننا بس ہے مجھے

قدرداں ہے میری محبوبی کی فطرت آپ ہی
سیر کرتی ہے مری خوبی کی فطرت آپ ہی

دادِ معصومی دیا کرتی ہے قدرت خود مجھے
لیتی ہے آغوش میں آ کے رحمت خود مجھے

بُلبلوں کا شور سننے کی کہاں فرصت مجھے
وقت اپنا مفت کھونے کی نہیں عادت مجھے

داغِ الفت نے گلستاں کر دیا سینہ مرا
میرے دل میں ہو گیا محفوظ گنجینہ مرا"

ح۔ب

احسن الکلام

ہمایوں کے سالنامے کے لئے چند شعر ایک غزل کے حاضر کئے جاتے ہیں۔ ہمایوں کے لئے میری خدمات سب سے پیچھے ہیں۔ اس کا احساس مجھے ہمیشہ رہتا ہے مگر ساتھ ہی اس کوتاہی کے اسباب بھی ایسے دائمی اور مستقل ہیں کہ گویا وہ مجھ سے جدا ہونا خلافِ وضع سمجھتے ہیں سچ کہا ہے وضعداری بری بیماری ہے۔ دیکھئے یہ بیماری کب پیچھا چھوڑتی ہے اگرچہ دیر ہو گئی ہے مگر امید ہے کہ کسی نہ کسی آخری صفحے میں ابھی گنجائش اندراج باقی ہوگی۔

احسن مارہروی

حُسن چاہے گا بہر حال نمایاں ہونا ۔۔۔ تم سے پردے میں بھی ممکن نہیں پنہاں ہونا

درد منظور، مداوا مجھے منظور نہیں ۔۔۔ ذلّتِ عشق ہے منت کشِ درماں ہونا

میرا مذہب ہے اگر عشق تو ایماں ہے تُو ۔۔۔ نیز النقصان ہے غارت گرِ ایماں ہونا

نہ ہنسا صبحِ شبِ وصل انہیں اپنی طرح ۔۔۔ کچھ حقیقت نہیں رکھتا ترا خنداں ہونا

غم نہیں گردشِ ایام سے پس جانے کا ۔۔۔ ہو مقدر میں جو خاکِ درِ جاناں ہونا

دلِ مضطر سا نہیں کوئی عجیب الخلقت ۔۔۔ جس کی قسمت میں ہے گھر رہ کے پریشاں ہونا

مقصدِ زندگیٔ دل ہے کسی پر مرنا ۔۔۔ حاصلِ عشق ہے جینے سے پشیماں ہونا

مرگِ وحشی پہ نہیں خاتمۂ جوشِ جنوں ۔۔۔ کہ کفن کو ابھی باقی ہے گریباں ہونا

تم نہ دو خواب میں تسکین کہ ہم دیکھیں گے ۔۔۔ انہیں خوابوں سے خیالوں کا پریشاں ہونا

سنگ دل تو بھی نہیں نابلدِ راہِ عزا ۔۔۔ تیری آنکھوں نے بھی دیکھا نہیں گریاں ہونا

چشمِ تر ہجر میں کہتی ہے کہ جل تھل بھر دوں ۔۔۔ ضبط کہتا ہے خبردار نہ گریاں ہونا

ہے یہ نیرنگِ تصوّر کہ تری یاد کے ساتھ ۔۔۔ آپ ہنسنا مجھے اور آپ ہی گریاں ہونا

وہ مرے غم سے ہیں خوش، سوچ رہا ہوں احسن
چاہیئے مرثیہ پڑھنا کہ غزل خواں ہونا

ایاز کی قبر تک

جس وقت ہم پُل پر سے بے تحاشا دوڑتے ہوئے اُتر رہے تھے، انجن پہلے آہستہ اور پھر زور سے سیٹی دے چکا تھا، اور اب اپنے پہیوں کی پہلی گردش کے ساتھ دھوئیں کے دو ایک مرغولے بھک بھک کرتا ہؤا چھوڑ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر اُترتے ہی ہم وحشیوں کی طرح تیز ہوتی ہوئی گاڑی کی طرف جھپٹے۔ اپنا اپنا ہینڈ بیگ بدحواسی کے عالم میں ہم نے گاڑی کے اندر پھینکا۔ اس کے بعد پہلے لپک کر میں سوار ہؤا اور پھر احسن صاحب کو تقریباً گھسیٹ کر میں نے گاڑی میں داخل کیا۔

جس ڈبے میں ہم سوار ہوئے تھے اُس میں چار حضرات پہلے سے بیٹھے تھے اور ہمارے خلفشار کو دیکھ کر سب ہماری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی اور اس سے زیادہ قدرتی یہ بات تھی کہ جب ہم نے منہ پھیر کر اُن کی صورتوں کا جائزہ لیا تو سب نے نگاہ نیچی کرلی اور یہ ظاہر کرنا چاہا کہ گویا انھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ احسن صاحب اگرچہ عمر میں صرف سال بھر مجھ سے بڑے ہیں مگر اداشناسی میں مجھ سے دس گنا اور شرافت میں یقیناً ہزار گُن بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ بظاہر مجھ سے لیکن دراصل اپنے باقی ہم سفروں سے خطاب کرکے کسی قدر ہانپتے ہوئے بولے: "ــــ پورے ــــ سے سٹیشن تک پچیس منٹ میں۔ پورے دو میل تھے، اور پھر پیدل!"

اپنے ہنگامہ خیز داخلے کی یہ شرح پیش کرکے احسن صاحب نے اپنے ہمراہیوں کو مطمئن کردیا اور وہ فرداً فرداً اونگھنے، نظریں اُٹھا کر خلا میں دیکھنے یا اپنے گھٹنے کو ایک خاص تال پر اُچھالنے میں بدستور سابق مصروف ہوگئے۔ مگر ایک صاحب کو آداب مجلس کی یہ معمولی سی پاس داری شاید گوارا نہ تھی۔ یہ ایک نسبتہً مُسن رسیدہ بزرگ تھے جو صورت سے شائستہ اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی نگاہیں میری طرف اس بے تکلفی سے اُٹھی ہوئی تھیں گویا دنیا کی سب سے قدرتی بات میرے چہرے کا معائنہ ہے۔ میں نے اپنے پریشاں بالوں کو ہاتھ سے سلجھاتے ہوئے ایک تیز و تُند نگاہ اُن پر ڈالی اور پھر اپنے قہر آلود چہرے کی خشمناکی کا پورا رخ اُن کی طرف پھیر کر اور اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ حد تک پسار کر اُن کے سامنے کی نشست پر ڈٹ گیا۔

"آپ سید ــــ صاحب مرحوم کے صاحبزادے تو نہیں ہیں؟"

بندوق کی آواز سے جنگل کے پرندے شاید اس طرح نہیں چونکتے۔ میں یک بیک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور میری ٹانگیں فوراً سمٹ کر اپنی قدرتی وضع میں آگئیں۔ یہ سوال اُنہیں صاحب نے کیا تھا جو میرے مقابل بیٹھے تھے۔ میں گھبرا کر صرف یہی کہہ سکا "جی ہاں ــــ فرمائیے" اگرچہ فرمائیے کہنے سے میرا کوئی خاص مطلب نہ تھا۔

"میرا غور سے دیکھنا آپ کو شاید ناگوار ہؤا لیکن ــــــ"

"جی نہیں بالکل نہیں مطلق نہیں۔ میں نے تو کچھ محسوس ہی نہیں کیا"۔

"لیکن آپ کی صورت اپنے والد مرحوم سے بہت زیادہ ملتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ آپ ہو بہو اُن کی تصویر ہیں۔ جب آپ نے اپنے گاؤں کا نام لیا۔ تو مجھے آپ کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ رہی۔ آپ کے والد مرحوم میرے نہایت عزیز دوست تھے ــــــ"

اتنا سن کر احسن صاحب بھی اپنی جگہ سے سرکے اور ہمارے پاس آ بیٹھے۔ میں نے اُن کا تعارف کرایا: "میر محمد احسن بی اے، میرے چچیرے بھائی" ساتھ ہی اُن صاحب نے اپنا نام بتایا تو معلوم ہوا کہ مجھے ایلچان کے دوست رائے بہادر پنڈت ــــ لال سے شرفِ گفتگو حاصل ہے۔ میں نے کہا: "ہمیں سخت ندامت ہے کہ ہم آپ کو پہچان نہ سکے۔ مگر والد مرحوم کے زمانے میں چونکہ ہم بالکل بچے ہی تھے ــــــ"

"جی ہاں، انہیں گزرے اگرچہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ہو گیا۔ مگر میرے دل میں اُن کی دوستی کا گہرا نقش اب تک محفوظ ہے۔ اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ اُن کو وہ دلی لگاؤ تھا۔ جو میرے ساتھ، اور معاف کیجئے اگرچہ اب آپ کا علاقہ ہندو مسلم فسادات کا مرکز ہے، میں نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب میر صاحب مرحوم زندہ تھے اور فخر سے کہا کرتے تھے۔ کہ ہمارے علاقے کے ہندو مسلمان دوست دوست نہیں بھائی بھائی ہیں۔ مگر یہ گزرے دنوں کی باتیں ہیں۔ وہ زمانہ کچھ عجیب زمانہ تھا۔ اب مجھے ہی دیکھئے۔ میں پرانی نسل کے آدمیوں میں سے ہوں اور ہندو ہونے کے باوجود میری ساری عمر اسلامی ہندوستان کے آثارِ قدیمہ کی تفتیش میں گزری ہے۔ ہندو تو اب ایک طرف رہے خود مسلمانوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی پرانی تہذیب اور اس تہذیب کے آثار سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں"

احسن صاحب نے ایم اے میں تاریخ لے رکھی ہے اور میں نے سائنس۔ سائنس میرے لئے حقائق کا ایک منظم مجموعہ ہے لیکن احسن صاحب کے لئے تاریخ محض شاعری کی ایک صنف ہے۔ وہ گذشتہ صدیوں کے واقعات کو اپنے تخیل کی آنکھ سے اس طرح دیکھتے ہیں گویا ایک طویل افسانہ ہے جس کی نمایاں خصوصیت اس کا شکوہ و طمطراق ہے۔ یوں بھی طبیعت ذرا پُرجوش ہے۔ اب انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ نسل پر رائے بہادر صاحب کی تنقید سنی تو بے تاب ہو گئے اور یہ ثابت کرنے پر اُتر آئے۔ کہ ماضی کے ساتھ شدید وابستگی مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی خصوصیت ہے۔ آپ نے تاریخ میں سے بہت سے شواہد پیش کئے اور اسی دوران میں کہا کہ مسلمانوں کی قبریں ہی ایک حد تک اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ وہ زندگی کے بعد بھی گزشتہ تعلقات کی یاد کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

رائے بہادر صاحب اُن کے اس جوش و خروش پر مسکراتے رہے لیکن یہ آخری دلیل سن کر انہوں نے ایک انگڑائی لی اور کہا: "قبروں کے متعلق آپ کا استدلال شاید صحیح ہو لیکن قبریں بنانا اور پھر انہیں منہدم ہونے کے لئے چھوڑ دینا یقیناً زندگی کے آثار میں سے نہیں ہے"۔

"مگر کیا صرف لاہور دہلی اور آگرے کے مغلیہ مقبرے آپ کے دعوے کے خلاف ایک زبردست دلیل نہیں ہیں؟"

"مجھے یہ تسلیم ہے کہ دنیا کے بہت سے بہترین مقابر اسلامی تہذیب کی یادگاریں ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر میں یہ کہوں گا کہ قدیم یونانیوں کے بعد کتابہ نگاری کے فن کو اگر کسی قوم نے سمجھا تو وہ مسلمان ہی تھے۔ مثلاً دلی میں جہاں آرا بیگم کی قبر پر لکھا ہوا یہ شعر دیکھئے۔

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزارِ مرا ۔۔۔ کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

یالاہور میں انارکلی کی قبر پر یہ شعر

آہ اگر من باز بینم روئے یارِ خویش را ۔۔۔ تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را

"یا پھر ہندوستان سے باہر مثلاً مرو میں الپ ارسلاں کی تربت کا کتبہ

سرِ الپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں؟ ۔۔۔ بہ مرو آتا بخاک اندر سرِ الپ ارسلاں بینی!

کیا حسن و زیبائی میں اس سے بہتر کتابے تصور میں آسکتے تھے؟ جن لوگوں کی قبروں پر یہ شعر درج ہیں اُن کی زندگی کی کتنی صاف اور سچی تصویر صرف ایک ایک شعر میں کھینچ دی گئی ہے۔ یہ سب درست ہے لیکن ان قبروں کی کس مپرسی پر بھی کبھی آپ نے غور کیا ہے؟

احسن صاحب اگرچہ مرعوب ہو چکے تھے تاہم انہوں نے اتنا کہنے کی ہمت پھر کی کہ مسلمان اپنے مشاہیر کے مقبروں کو ایک طرح کے قومی ادارات خیال کرتے ہیں اور عوام و خواص سب اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ قوم کی زندگی میں ان مقابر کی اہمیت کیا ہے۔ یہ دلائل تو نہایت شاندار تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر رائے بہادر صاحب کی وسیع واقفیت اختلاف کا یارا نہ دیتی تھی۔ مثلاً احسن صاحب گفتگو کی روانی میں جب سعدی کا ایک مصرع پڑھ گئے تو رائے بہادر صاحب نے مسکرا کر کہا: "بیچارے شیخ سعدی کا مزار شیراز میں ایک اور عبرتناک نظارہ ہے" ———— (پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر) "اب لاہور ہی کو لیجئے۔ جہانگیر، نورجہاں اور آصفجاہ کے مقبرے اچھی حالت میں ہیں اور ان کو مسلمان صرف اس لئے جانتے ہیں کہ یہ اُن کی تفریح اور سیرگاہ ہیں۔ لیکن عرفی قطب الدین ایبک اور زیب النسا بیگم کی قبروں کو جاننے والے بہت کم نکلیں گے اور یہ سب نہایت درماندہ حالت میں ہیں"۔

ہم اگرچہ رائے بہادر صاحب کے تبحر علمی سے بہت متاثر ہو رہے تھے مگر اس موقع پر ہم نے فخر سے ذرا مسکرا کر کہا: "ہم نے تو انہیں دیکھا ہے"

"مجھے یہ سن کر دلی خوشی ہوئی۔ زمانۂ حال کا عام مسلمان تو ان چیزوں سے بے حد غافل ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ لاہور میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک محفل تھی جس میں میں نے تذکرۃً یہ کہا کہ لاہور کا تمام سول ایریا جہاں اب ٹھنڈی سڑک اور لارنس باغ پھیلے ہوئے ہیں کسی زمانے میں مسلمانوں کا قبرستان تھا۔ یہ سن کر سب لوگ سخت متعجب ہوئے۔ اسی طرح ایاز جس کی ذات تک مسلمانوں کی بہت سی تاریخی اور ادبی روایات پہنچتی ہیں، اُس کی قبر اگرچہ لاہور میں ہے ————"

"ایاز کی قبر لاہور میں!!" احسن صاحب تو جوش میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں اسی طرح بھونچکا بیٹھا رہا۔ ہماری آنکھیں خود بخود ایک دوسرے کی طرف اُٹھیں اور ایک ہی نگاہ میں ہم نے اپنی جہالت کا اعتراف کیا۔

لاہور کا اسٹیشن اب آپہنچا تھا۔ ہم نے نہایت شوق سے ایاز کی قبر کا پتا پوری تفصیل کے ساتھ رائے بہادر صاحب سے پوچھا۔ اور اُن کے سامنے اپنے اس عہد کا اظہار کیا کہ سب سے پہلی فرصت میں ہم ضرور وہاں جائیں گے۔ اس کے بعد ہم نے اُن کا بیحد شکریہ ادا کیا اور اپنی نالائقی اور غفلت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے گاڑی سے اُترے۔

۲

چار دن بعد

سڑک کے ایک طرف ہندوؤں کے تنور اور دوسری طرف بنیوں کی دکانیں جن کے چبوتروں پر آٹے دال چاول سے بھری ہوئی بوریاں سجی تھیں۔ اسی جگہ دیہات سے آئے ہوئے چند گراں ڈیل کسانوں کا ایک جھنڈ اپنے گاڑھے کے تہمد اور گھٹنوں سے نیچے پہنچتے ہوئے کرتے پہنے، اپنے لمبے بالوں پر مختصر سی پگڑیاں رکھے اور ہاتھ میں قد آدم لاٹھیاں لئے ہوئے معمول سے زیادہ بلند آہنگی اور دست و بازو کی تمام آزادانہ جنبشوں کے ساتھ آپس میں کچھ مشورہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ سڑک کی معمولی آوازوں کی بھنبھناہٹ اگر کسی چیز سے ٹوٹتی تھی تو وہ یہ صدا تھی:

پیسے کی پونا پا، لا! پیسے کی پونا پا، لا!!

یہ گنڈیری والے کی آواز تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اس آواز کو برسوں سنتے رہنے کے باوجود میں آج تک اُس صنعت کو نہیں سمجھ سکا جس سے گنڈیری والا "تو" کو "لا" کہہ جاتا ہے اور کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا۔ سڑک پر دو تین گنڈیری والے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے لکڑی کا ایک ایک تختہ اپنے سامنے زمین پر لگائے، بڑی پھرتی سے گنا چھیلنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہر شخص نے اپنا اپنا پونڈے کا گٹھا اپنے ساتھ ہی زمین پر جما رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً وہی رٹ لگائے جا رہا تھا، "پیسے کی پونا پا، لا! پیسے کی پونا پا، لا!!"

اس سے آگے پھل کی ایک آدھ دکان کیلوں سنگتروں اور سیبوں سے سجی ہوئی، پھر سبزی کی چند دکانیں جن میں انڈوں سے بھرے ہوئے چھینکے چھت سے لٹکے ہوئے۔ اُس کے بعد ایک پرانی محراب جس میں سے گزرتے ہی ایک پر رونق بازار اور اس کی ہوا ہلدی سونٹھ اور مہندی کی بو سے بسی ہوئی —— ہم شاہ عالمی دروازے کے اندر تھے اور سلطان محمود کے صوبہ دار پنجاب کے دربار میں جا رہے تھے!

احسن صاحب کے اصرار پر ہم دونوں نیو ہوسٹل سے اپنی اپنی بائیسکل پر سوار ہو کر آئے تھے۔ لیکن جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ دانائی پیدل آنے میں تھی (نوجوان بے وقوف ہوتے ہیں —— یہ ایک مقولہ ہے اور اپنے بزرگوں کی زبانی اس کے سننے کا اتفاق اکثر ہوتا رہتا ہے) تھوڑی دور تک ہم اسی طرح بائیسکلوں پر سوار گھنٹی زور زور سے بجاتے، بچتے مڑتے، سمٹتے کتراتے ہوئے چلے گئے۔ لیکن رستے میں یوں ہوا کہ ایک خوش عقیدہ بنئے کی دکان پر نمک کا ایک بڑا سا ڈلا پڑا ہوا تھا اور ایک موٹا تازہ سانڈ اُسے خوب دل لگا کر چاٹ رہا تھا۔ پاس سے دس بارہ سال کا ایک لڑکا نمک بالشکر کی پڑیا ہاتھ میں لئے گزرا۔ اُس نے چپکے سے آگے بڑھ کر سانڈ کی دم پر ہاتھ رکھا اور پھر زور سے ایک چٹکی لے کر یہ جا وہ جا ہوا ہو گیا۔ بچے آخر بچے ہوتے ہیں (مقولہ نمبر ۲۔ یہ بھی بزرگوں سے سنا ہے) لیکن اس معصوم کی شرارت سے یہ ہوا کہ سانڈ کلبلا کر پیچھے ہٹا اور ہم جو بالکل پاس پہنچے ہوئے تھے۔ یکا یک بائیسکلوں سے اُتر کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد سانڈ اپنے معمولی سست انداز میں مڑا اور اپنی بے ڈھنگی چال سے بازار میں چلنے لگا۔

شاہ عالمی دروازے سے رنگ محل تک یوں بھی اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور اکیلا آدمی بھی بار ہا سامنے سے آنے والوں کے ساتھ بھڑ جاتا ہے چہ جائیکہ دو آدمی ایک ایک دو چرخی ہاتھ میں تھامے اکٹھے چل رہے ہوں یا کم از کم اکٹھے چلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہم نے بائیسکل سے اتر کر خیریت اسی میں سمجھی کہ سانڈ کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیں۔ بس احسن صاحب کو اُس کی دم کے حیاتیاتی

وظائف، اُس کی رانوں کے اُبھار اور اُس کی چھاتی کے عضلات کی ساخت پر ایک طولانی درس دینے لگا اور اس تمام دوران میں ہم اپنی اپنی بائیسکل پکڑے برابر سانڈ کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

ہم نے اس طرح چلتے چلتے ابھی زیادہ فاصلہ طے نہ کیا تھا اور حیوانیات پر میرا درس ابھی تمام ہی تھا کہ سامنے سے پچاس ساٹھ آدمیوں کا ایک انبوہ ایک دوسرے پر گرتا پڑتا تیزی سے بڑھتا ہوا آگے کو آیا۔ ہم ان لوگوں کو رستہ دینے کے لئے ایک طرف کو ہٹ کر ایک دکان کے ساتھ کھڑے ہو گئے جو حسن اتفاق سے یہ ایک حلوان والے کی دکان تھی اور جب تک ہمیں وہاں ٹھہرنا پڑا تاہم اُس کے بڑے آئینے میں جی بھر کر اپنا اپنا منہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس بھیڑ کے پہلے چند آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے جب گزر گئے تو ہم نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ ابھی اور بھی ہیں جو زیادہ اطمینان سے چل رہے ہیں اور ان کے بعد ابھی اور، اور پھر ہمارا رہنما سانڈ صاحب تک اسی بھیڑ میں کہیں غائب ہو چکا تھا اور ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جس طرح بھی بنے اس سمت رفتار ہجوم کو چیر کر آگے بڑھیں۔ چنانچہ خدا کا نام لے کر آگے آگے احسن صاحب اور پیچھے پیچھے میں چل پڑا۔

ہم شاید پندرہ قدم چلے ہوں گے یا بیس قدم کہ ہمیں بھیڑ میں ایک متحرک مچان نظر آیا جس پر ایک سفید ریش سکھ بزرگ کالی سیاہ پگڑی پہنے کھڑے کچھ گا رہے تھے۔ یکایک مچان کی حرکت رک گئی۔ اور سکھ بزرگ نے تقریر شروع کی۔ مچان کے رکتے ہی ہم کو بھی ٹھہرنا پڑا۔ میرا رستہ ایک لمبے تڑنگے قوی ہیکل اکالی نے، جس کی کمر میں ایک غیر معمولی طور پر لمبی کرپان حائل تھی، ایک سنگین دیوار بن کر روک رکھا تھا۔ میں نے بھیڑ سے فائدہ اٹھا کر اُسے دو چار دھکے بھی دئے۔ لیکن وہ سنگلاخ کی طرح اپنی جگہ پر پیوست تھا اور اُسے خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ دو ایک بار میں نے جھک کر اُس کی ٹانگوں کے درمیان سر ڈالا اور ادھر اُدھر جھانکنے کی کوشش کی مگر کوئی راہ فرار نظر نہ آئی۔ تنگ آ کر آخر میں نے اُس کا ہاتھ زور سے ہلایا اور اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ جب اُس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور میری نظر اس کی شاندار ڈاڑھی پر پڑی تو مجھے سخت ندامت ہوئی اور میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ پر نفرین بھیجی کہ میں نے بھیڑ میں ایسا ناجائز فائدہ کیوں اُٹھایا۔

بہر حال میں نے اپنی مصیبت اُس سے کہی اور دریافت کیا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ وہ مسکرایا اور اُس کی لمبی ڈاڑھی اور زیادہ شاندار ہو گئی۔ حقیقت یہ کھلی کہ آج خوش قسمتی سے گورو گوبند سنگھ جی کا جنم دن ہے اور اس قسم کی بھجن منڈلیاں تمام شہر میں گشت لگا رہی ہیں۔ ساتھ ہی اکالی نے ایک اور تبسم کے ساتھ ہمیں مشورہ دیا کہ یہیں سے اُلٹے پاؤں پھر جانا اور کسی دوسرے رستے سے شہر میں داخل ہونا ہمارے لئے اچھا ہوگا۔ کیونکہ اس بھجن منڈلی کے پیچھے ابھی اور بھی منڈلیاں ہیں۔

یہ حال خدا کو معلوم ہے کہ ہم اپنی بائیسکلوں کو گھسیٹتے ہوئے کس طرح واپس پلٹے اور کس طرح اس بھجن منڈلی کو قطع کر کے صحیح و سلامت نکل آئے لیکن اتنا شک ہم نے ضرور کیا کہ بھیڑ میں ہم بہت آگے نہیں بڑھے تھے اور تھوڑی سی کشمکش کے بعد ہی مخلصی ہو گئی۔

شاہ عالمی دروازے سے نکل کر کچھ دیر ہم باغ میں بیٹھے اور بھیڑ میں ہمیں جو تجربات فرداً فرداً ہوئے تھے انہیں دہراتے رہے۔ اس کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ اس دفعہ موچی دروازے کی طرف سے رنگ محل پر دھاوا کرنا چاہیئے۔

موچی دروازہ جیسے تو دروازہ ہے اور نہ کفش دوزی کے کام ہی سے کوئی نسبت رکھتا ہے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ پانچ منٹ میں وہاں آ پہنچے اور اندر داخل ہو کر رنگ محل کی سمت میں چل پڑے۔ رونق یہاں بھی ہے لیکن وہ رونق نہیں جس کے متعلق ہر گھڑی یہ دھڑکا

لگا ہے کہ بس ابھی بلوہ ہوا کہ ہوا۔ ہم مزے مزے باتیں کرتے جا رہے تھے اور لاہور کے دو مشہور حلوائیوں کی آراستہ دکانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے تفریح کے لئے شاید ایک آدھ نظر اُن پر ڈال رہے تھے کہ دھوبیوں کے ایک گلّے کو رستہ دینے کے لئے ہمیں ایک طرف کو ہٹنا پڑا۔ گائے بھینس کے ریوڑ چونکہ ہر روز ان بازاروں میں سے گزرتے ہیں اس لئے ہم بلا تکلف اسی طرح اطمینان کے ساتھ باتیں کرتے کرتے ہٹ کر ایک گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو گئے۔

ہمارے پاس ہی ایک مشٹنڈا سا گورا چٹا پہلوان صورت آدمی بھی کھڑا تھا۔ اس کی وضع قطع ویسی ہی تھی جیسی موچی دروازے کے اکثر بیٹھکروں کی ہوتی ہے۔ یعنی داڑھی صفا چٹ، بڑی بڑی بل کھائی ہوئی مونچھیں، سر پر سفید کھڑے کی ٹوپی، گلے میں لٹھے کی قمیص اور مخمل کی صدری اور نیچے لٹھے کی سفید براق چادر اور قصوری جوتا۔ ہاتھ میں ایک پتے پر حلوا پوری رکھے وہ بظاہر ذوق و شوق سے کھا رہا تھا لیکن ہم نے دیکھا کہ جونہی اسی گلی کے ایک مکان میں سے اٹھارہ بیس سال کا ایک نوجوان باہر نکلا اُس نے اپنا حلوا پوری ساتھ کے چبوترے پر رکھ دیا اور مونچھوں کو ہاتھ پھیر پونچھ ذرا تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف ہم کھڑے تھے دوسری طرف صدری پوش نے رستہ روک رکھا تھا۔ نوجوان نے سمٹ کر گزر جانا چاہا لیکن صدری پوش نے ہمارے دیکھتے دیکھتے اسے زور سے اپنا کندھا مارا اور پھر ناگہاں اُس کا گلا دبوچ لیا۔ اور ساتھ ہی یہ کہہ کر اُسے مارنا شروع کر دیا "کیوں بے گالی کیوں بکتا ہے؛ ہیں بے گالی کیوں بکتا ہے؟"

ہم حیران اور ششدر رہ گئے کیونکہ لباس سے نوجوان تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کی طُرّہ دار پگڑی اب زمین پر گر پڑی تھی مگر اُس کا کوٹ شلوار اور بوٹ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ ہمارا پہننے والا اس سلوک کا عادی نہیں ہے۔ ایک لمحے کے بعد ہمارے استعجاب نے ہمیں زبان کھولنے کا یارا دیا۔

"ہیں یہ کیا؛ اسے بھئی یہ کون ہے جس کو مار رہے ہو؟"

جناب یہ چنگی خانے کا منشی ہے"

اس کو ہمارے سوال کا نہایت قدرتی جواب سمجھ کر اُس نے زناٹے کا ایک اور گھونسا اُسے رسید کیا"۔ اس کی گالی کی ایسی تیسی؛ کیوں بے اب دے گالی، اب دے گالی، دیتا ہے اب"؛ اور ساتھ ہی ایک اُٹھا ہوا ہاتھ بچارے نوجوان کی پیٹھ پر آ رہا۔

میں نے اور احسن صاحب نے مل کر بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کیا۔ وہ بچارا اپنی پگڑی سنبھال فوراً چلتا بنا اور اس نے کپڑے ہاتھ سے جھٹک حلوا پوری پھر اُٹھالی گائیں بھینسیں اور اُن کے ہانکنے والے گوجر اب سب گزر چکے تھے لیکن ہم تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے حیرت سے اُس شخص کا منہ تکتے رہے۔ آخر میں نے پوچھا:

"کیوں بھئی آخر یہ قصہ تھا کیا؛"

"جناب آپ کیا بتاؤں۔ یہ کمین لوگ دو حرف پڑھ جائیں، کرسی بیٹھنے کو مل جائے تو سمجھنے لگتے ہیں کہ رب نے شاید ہمیں ہی کُل عالم پر لاٹ بنا کر بھیجا ہے۔ اشرافوں پر تو لیوں نے دنیا تنگ کر رکھی ہے۔ میں نے بھی کہا آؤ آج لگے ہاتھ اس کی تھوڑی سی مرمت ہی کر دو۔ پتا پھر تلے ہے بابو"۔

"بھئی سمجھ میں نہ آئی یہ بات ———"

"جناب آپ اس کا بڑا بھائی فضل دین ہے ٹُنّس میں گر بڑا ظالم پلیا ہے۔ غریب پر اس کا ہاتھ بڑا سخت ہے۔ ابھی یہ پچھلی جمعرات کی بات ہے کہ میری گلی میں ہے قدرداد۔ بڑا شریف آدمی ہے میں آپ کو کیا بتاؤں حد شریف آدمی ہے۔ چار بچے ہیں۔ وہ شُدہ (شہدہ = غریب) اپنی ہاتھ گاڑی پر کچھ سنترے مالٹے لگا کر دروازے سے باہر نکلا۔ کہ سڑکوں پر اِدھر اُدھر ذرا پھیری لگا آئے۔ اب یہ فضل دین دروازے سے باہر سڑک پر کھڑا

تانگے ٹمٹم کو ہاتھ دے رہا تھا۔ شدہ قدر داد شریف آدمی، افسروں کی اولاد معہ کیا جانے ان باتوں کو فضل دین نے دوسری طرف ہاتھ دیا، اس نے اپنی گاڑی ٹھیل دی۔ تو جناب فضل دین کہتا کیا ہے کہ قدر داد کو اُسی جگہ دھر نہیں لیتا اور پھر کاظم بیگ مجسٹریٹ کی عدالت میں چالان نہیں کر دیتا۔ اُدھر حاکموں کے کان ہی کان ہیں آج کل آنکھیں ہیں نہیں۔ کاظم بیگ نے فٹ پانچ روپے جرمانہ کر دیا (منہ میں حلوے کا ایک لقمہ ڈال کر اور آنکھیں ذرا بند کر کے افسوس کے انداز میں سر ہلا کر) دیکھ لینا جناب ایک نہ ایک دن اس کاظم بیگ کو کسی غریب غُربے کی ہائے لے جائے گی۔ باقی رہا یہ فضل دین اور اُس کا بھائی جو پاس کھڑا تھا سو میں نے دل میں کہا اچھا بچو رہ تو جاؤ۔ کسی دن اندھیرے اُجالے میں مل گئے اور مُرمّت نہ کر دی تو میرا نام مرمعاج دین (معراج دین) نہیں۔ کیا بتاؤں جناب ان پُلسیوں نے تو آج کل خدائی دعویٰ باندھ رکھا ہے۔ ہمہ شمہ کو تو کتا سمجھتے ہیں کتا ـــــــ"

اس عجیب و غریب منطق سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے پھر رنگ محل اور ایاز کی قبر کا رخ کیا لیکن یہ بازار ہی شاید زندہ دلانِ لاہور کی تمام ہنگامہ خیزیوں کی جولاں گاہ تھا کہ چند قدم چل کر ایک نئی دلچسپی ہماری توجہ کا مرکز بن گئی۔

ایک ہنستا کھیلتا ہُوا ہجوم خوشی کے نعرے لگاتا دوسری طرف سے ہماری طرف بڑھا چلا آتا تھا۔ پہلے ہمیں شبہ ہُوا کہ یہ شاید کسی لیڈر کا جلوس ہے لیکن پھر خیال آیا کہ لیڈر تو آج کل سبھی جیل میں ہیں۔ ہو نہ ہو یہ کسی اور قسم کے آدمی کا جلوس ہے۔ معاً ایک عجیب نظارہ ہمیں دکھائی دیا۔ تین چار آدمیوں نے بازو پھیلا کر ایک نشست سی بنا رکھی تھی جس پر ایک شخص برہنہ تن صرف لنگوٹی باندھے بیٹھا تھا۔ اب لیڈر کے جلوس کا رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا کیونکہ مہاتما گاندھی کے سوا کوئی لیڈر اس پوشش میں جلوس نکلوانا گوارا نہ کر سکتا تھا اور مہاتما گاندھی کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔

وہ شخص جس کو لوگ اپنے ہاتھوں پر اُٹھائے ہوئے تھے سرسوں کے ہرے ہرے پودوں کے "ہار" گلے میں، بانہوں میں، کندھوں پر، گود میں لئے ہوئے تھا۔ لوگ خوشی کے نعرے مارتے تھے کچھ شاید دلی مسرت سے کچھ محض مسخرہ پن سے اور وہ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر انہیں سلام کرتا تھا۔ اس سلام میں اختیار یا ارادے کو کوئی دخل نظر نہ آتا تھا بلکہ اُس کے دونوں ہاتھ کسی خفیہ کل کے اشارے سے اضطراراً ایک خاص تال پر اچھلتے معلوم ہوتے تھے اور اُن میں ایک پیہم متوازی جنبش پیدا تھی۔ اس کے دھڑ کے اندر بھی شاید کوئی ایسی ہی کل لگی تھی کیونکہ اپنے عجیب و غریب دو دستی سلام کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نشست پر بیٹھا اس تسلسل سے پھُدک رہا تھا کہ مجھے بے اختیار وہ کمانی دار کھلونے یاد آنے لگے۔ جو بچپن میں مجھے ابا جان مرحوم لا کر دیا کرتے تھے۔ اِن کھلونوں کو ہاتھ سے ذرا چھیڑ دیا جاتا تو اُن کے سر بازو یا دھڑ پر بہت دیر تک اہتزاز کی کیفیت طاری رہتی۔ اس شخص کے ہاتھوں کا اچھلنا اور دھڑ کا پھدکنا بھی اتنا ہی یکساں ہموار اور بے معنی تھا۔ اگر کوئی تبدیلی ہوتی بھی تو اُس وقت جب ہجوم میں سے کوئی شخص ہری سرسوں کا ایک نیا مُٹھا اُس پر نچھاور کرتا۔ اُس وقت پھدکتے ہوئے دھڑ کا سر نچھاور کرنے والے کی سمت میں مڑتا اور ہاتھوں کی پیہم متوازی جنبش کسی قدر زیادہ تیز ہو جاتی۔

لاہور میں رہتے ہوئے ہم کو سال ہا سال ہو گئے تھے لیکن یہ نظارہ ہمارے لئے یکسر اسرار تھا۔ آخر خوشی کے مارے بوکھلائے

ہوئے ایک فداکار کو آستین سے پکڑ کر ہیں نے اس معاملے کی حقیقت پوچھی تو اس نے کہا "آپ نے سنا نہیں؟ پریٹ (پریڈ) میں آج بڑا معرکہ ہوا ہے"۔ احسن صاحب بچارے شریف آدمی ہیں گھبرا کر پوچھنے لگے "کیوں بھئی کوئی خون تو نہیں ہوا؟" اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہا "جی نہیں بابوجی مینڈھوں کی لڑائی ہی تو تھی جمن دین اور غلام محمد کے مینڈھے بھڑے۔ غلام محمد کی جیت رہی۔ اب غلام محمد کو اُٹھا کر اپنے کوچے کو لے جا رہے ہیں"۔ احسن صاحب نے مسکرا کر مجھ سے کہا "خیر پیر شو بیا موز۔ لیکن حیرانی یہ ہے کہ لڑائی تو اس کے مینڈھے کی ہوئی، یہ خود کیوں جنگل کا لباس عریانی پہن کر پریڈ سے آ رہا ہے اور پھر اس سردی میں"۔

اتنے میں ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارا وہی صدری پوش دوست ہمارے پیچھے کھڑا ہے۔ اُس نے وہیں سے چلا کر کہا "یار گامے! لاکھ لاکھ مبارکباد ہوں۔ اسے یار ہم کو تمہارے پر بڑا افسوس ہے ہم کو تم نے پتا ہی نہ دیا اور مینڈھے کو پریٹ لے گئے۔ اگر ہم کو خبر کر دیتے تو باجے گاجے کا کچھ بند وبست ہو جاتا۔ گھڑی دو گھڑی دل بہل جاتا۔ تم کو یاد ہے نہ پرار سال 'غلاب دین' کے مینڈھے کو ہم ماسٹر گلزار کے بینڈ کے ساتھ گھر لائے تھے"۔ "یار گامے" نے جواب دینے کے لئے سر پھیرا ہی تھا کہ ہجوم میں سے کسی کا ایک اور مٹھا نازل ہوا اور اُس نے پھر یہ کہنا شروع کر دیا کہ مانی پر چوٹ لگ چکی تھی جلوس آگے بڑھ گیا۔

اب رستے میں نہ کوئی نئی دلچسپی تھی اور نہ رکاوٹ بجز اس کے کہ کہیں کہیں رنگریز کوئی دوپٹہ یا پگڑی رنگ کر اُسے سکھانے کے لئے اپنی دکان کے سامنے سڑک کے آر پار پھیلاتے ہوئے ملتے تھے۔ جب کوئی راہگیر آتا تو اُن کے ساتھ قطار باندھ ہوا سے پھولی ہوئی ململ کو اوپر دائیں بائیں اس پھرتی کے ساتھ لے جاتے کہ راہگیر کو چلنے میں کوئی دقت نہ ہوتی اور وہ اپنی دُھن میں گزر جاتا۔ ہم کو بچنا اگر پڑتا تھا تو اُن کوؤں اور کبوتروں سے جو ہمارے سر کے عین اوپر بجلی کے تاروں پر بیٹھے تھے۔ اِن کے ہاں قضائے حاجت کی ایک خاص رسم ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی شخص نیچے سے گزر رہا ہو تو نشانہ تاک کر ٹھیک اُس کے سر پر بیٹ کرتے ہیں۔

بازار میں آنے جانے والے اس قدر کم تھے کہ بائیسکل کی سواری بآسانی ہو سکتی تھی لیکن اب ہم خود بخود پیدل چلنے کو ترجیح دے رہے تھے ایاز کی قبر کا خیال ایک قریب تر حقیقت کی حیثیت سے ہمارے دماغ پر اپنی پوری جذباتی کیفیتوں کے ساتھ روشن ہو رہا تھا۔ فارسی اور اُردو ادب کی تمام مشہور چیزیں جن کی تلمیح ایاز کی زندگی کی طرف جاتی ہے ہم نے دل ہی دل میں دہرا ڈالی تھیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ میرے مقابلے میں احسن صاحب بہت زیادہ متاثر معلوم ہو رہے تھے۔ یا یوں کہئے کہ اگر اُن کے دل پر اس وقت

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

کی شاعرانہ کیفیت طاری تھی تو میرا دل

ایاز قدرِ خود بشناس

کی تشریت کا حامل تھا۔

اسی محویت کے عالم میں ہم رنگ محل پہنچے اور مشن سکول سے گزرتے ہی میں نے احسن صاحب کو بیدار کیا کہ حضرت اب ذرا آپ بھی بائیں ہاتھ نظر ڈالتے جائیے۔ پچاس ساٹھ قدم چل کر ٹکسال بازار کی تختی ہمیں صاف نظر آگئی۔ کوچے میں مڑتے ہی ہم نے ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا "کیا ایاز کی قبر یہیں ہے؟" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "جی ہاں ملک ایاز کی خانقاہ یہی ہے"۔

سامنے درزی کی دکان تھی جہاں وہ اپنے شاگردوں کو لئے بیٹھا تھا۔ اس کی دکان سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی مسجد نما عمارت تھی۔ عمارت کیا تھی تین محراب کا ایک دالان اور اس کے سامنے ایک مختصر سا صحن تھا۔ دالان کے اندر چند شہتیریاں اور کڑیاں پڑی تھیں اور ایک بڑھئی کا لڑکا ان پر رندہ کر رہا تھا۔ درزی کی دکان سے اس کی مشینوں کے گھمر گھمر چلنے کی آواز صاف آتی تھی۔ ان آوازوں کے درمیان صحن کے عین وسط میں ایاز کا جسد خاکی ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا چبوترا تھا اور اس کے بیچ میں دو فٹ کے قریب اٹھا ہوا تعویذ قبر کا نشان دے رہا تھا۔ قبر پر سبز کپڑے کا ایک غلاف چڑھا ہوا تھا اور سرہانے کی طرف گیندے کے پھولوں کا ایک ہار پڑا تھا۔ چبوترے کی اینٹوں پر برسوں کے تیل کے نشان تھے۔ پاس ہی زمین پر کچھ گنگنی بکھری ہوئی تھی۔ دو چار چڑیاں اُسے چگ رہی تھیں۔ چند پھول چند پودے اور ایک سدا بہار بیل کے پتے اُس شخص کے ہمسائے تھے جس کی ہمت نے نو سو سال ہوئے لاہور کو نیست سے ہست کیا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ایاز کا پرجلال آقا لاہور کے برہمن راجہ کو اس کی بدعہدی کی سزا دیتا ہوا اپنے قہر کا نقش ایک ویران شہر کی شکل میں پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد ایاز نے کس محبت سے اس ویرانے کو پررونق بازاروں اور رنگین نظاروں سے آباد کیا تھا۔ آج اس شہر میں بسنے والوں کے لئے وہ خود ایک نظارہ تھا۔

فاتحہ کے لئے ہم دونوں کے ہاتھ اُٹھے۔ اس وقت میری نظر بھائی احسن کے منہ پر پڑی۔ میں اُن کی حساس طبیعت سے واقف تھا لیکن اب اُن کے چہرے کے نازک خد و خال پر وفورِ جذبات سے ایک کیفیت طاری دیکھ کر میں بھی چونک گیا۔ ان کے طاقتور تخیل نے انہیں لاہور کے ایک تنگ کوچے کی فضا سے اُٹھا کر نو سو سال قبل کی دنیا میں لا ڈالا تھا۔ شاید اُن کی آنکھ محمود غزنوی کے اس عظیم الشان یلغار کو دیکھ رہی تھی جو دنیا کی تاریخ کشور کشائی میں اب بھی ایک کارنامے کی حیثیت سے یادگار ہے۔ کس طرح محمود زمین باد کی طرح غزنی سے ملتان پہنچا اور ملتان سے بڑھ کر اس بے برگ و گیاہ ریگستان کو جو اجمیر تک پھیلا تھا گویا طرفۃ العین میں طے کر گیا اور پھر اس شہر پر جا پڑا جس کی تصویر کو پیارے لال نے اپنے زور بیان سے زندہ کر دیا ہے۔ وہ شہر جو سمندر کے کنارے آباد تھا، بڑا گلزار، دولت سے مالا مال، یہاں بلند قلعے کے نیچے پانی لہراتا تھا اور اونچی اونچی فصیلوں سے ٹکرا کر جھکولے مارتا تھا۔ اور پھر قلعے کے اندر جا کر سومنات جی کا مندر جس کی چھت کو چھپن ستون سنبھالے کھڑے تھے جس میں رات دن صرف ایک چراغ جلتا تھا اُس کی روشنی جواہرات پر پڑتی تھی اور اُن کی جوت سے سارا مکان جگمگ جگمگ کرتا تھا ——————

یہ کیفیت تھی جب قبر کا مجاور ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ احسن صاحب نے شاید قبر کے کچھ حالات اس سے پوچھنے چاہے۔ اور گفتگو شروع کرنے کے لئے کسی قدر کانپتی ہوئی آواز میں اُس سے پوچھا

"یہ ایاز کی —— ملک ایاز کی قبر ہے؟"

"جی ہاں جناب یہ "ملک الیاس صاحب کی خانگاہ" ہی ہے۔"

اس جواب پر میں بہ مشکل مسکرائے بغیر رہ سکا۔ احسن صاحب بھی کچھ گھبرائے لیکن ہمت کر کے پھر پوچھنے لگے:

"تم لوگ کب سے اِس خانقاہ کے مجاور ہو؟"

"جناب ہم اپنے باپ دادا کے وقت سے اسی خانگاہ کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں۔"

احسن صاحب کی آنکھیں اس جواب پر چمک اٹھیں۔ مورخانہ تحقیق کی روح پھر بیدار ہو گئی۔

"پھر تو اس خانقاہ کے متعلق کچھ روایتیں بھی تم نے ضرور سُنی ہوں گی، مثلاً پہلے تو یہی بتاؤ کہ تمہارے باپ دادا کے پاس یہ خانقاہ کس زمانے میں آئی؟"

"جناب اس خانگاہ کی نسبت جھوٹی سچی من گھڑت کہانیاں اگر آپ سُننا چاہیں تو آپ کو کتابوں میں بھی بہتیری مل جائیں گی کیونکہ خانگاہ کا ذکر بڑی بڑی کتابوں میں جگہ جگہ آیا ہے۔ لیکن سچی واردات اگر آپ چاہیں تو پھر وہ ہمارے خاندان کے سوا کہیں نہیں ملے گی"۔

"اسی لئے تو پوچھا ہے کہ تم لوگ کب سے اس خانقاہ کے مجاور ہو"؟

"ہم کو اس خانگاہ پر بیٹھے عرصہ دو ہزار سال کا ہو گیا ہے۔ ملکُ الیاس صاحب سلطان محمود کے وزیر تھے۔ سومنات کا معرکہ جو بڑا مشہور ہے انہیں کی ہمت سے سر ہُوا ان کے بھائی خواجہ خضر صاحب بھی انہیں کی طرح بڑے جوانمرد تھے چنانچہ سلطان محمود جب کل عالم کو فتح کر چکا تو اُس نے ملکُ الیاس کو خشکی اور خواجہ خضر کو تری بخش دی جب سکندر بادشاہ نے لاہور پر چڑھائی کی ہے تو ہم کو اس خانگاہ پر عرصہ نو سو سال کا ہو گیا تھا سکندر نے خانگاہ کی بے عزتی کرنی چاہی لیکن اس وقت خواجہ خضر راوی کے پانی میں سے اٹھے اور ———"

احسن صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہنسی کو ضبط کرتے کرتے میرا برا حال ہو گیا تھا۔ آخر میں نے احسن صاحب کا ہاتھ کھینچا اور زبان کو دانتوں تلے دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "اب ذرا جلد چلنا چاہئے آپ کو یاد ہے نہ ——— آج خوش قسمتی سے گورو گوبند سنگھ جی کا ———"

حمید احمد خاں

ایک شخص نے ڈاکٹر جانسن سے کہا "میں ایک خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر اس سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ سے زیادہ عقلمند اور ہوشیار ہے"۔ جانسن نے کہا "ڈرو مت اور اُس سے شادی کر لو اور یقین جانو کہ سال سے پہلے پہلے اُس کی عقل و ذکاوت دونوں میں کمی آجائے گی"

نیوٹن مشہور انگریزی سائنس دان اپنی انگیٹھی کے سامنے بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ آگ تیز تھی۔ نیوٹن وہاں بیٹھا گرمی سے بے تاب ہونے لگا۔ اُس نے اپنے ملازم کو آواز دی اور کہا "آگ بہت تیز ہے اسے ہلکی کر دو۔ ملازم بولا حضور اگر آپ اپنی کرسی ذرا پیچھے سرکا لیں تو آپ کو اتنی گرمی نہ لگے۔ نیوٹن نے کہا عجیب بات ہے کہ اس کا مجھے خیال تک نہ آیا

ایک بڑا باتونی نوجوان سقراط کے پاس خطابت سیکھنے آیا۔ یونانی فلسفی نے اس سے دو چند مشاہرہ طلب کیا یہ کہہ کر کہ مجھے تم کو دو علم سکھانے ہیں ایک نہ بولنے کا علم دوسرا بولنے کا

ایک شخص سے جو محفل میں خاموش بیٹھا تھا یونانی حکیم تھیوفراسٹس نے کہا "اگر تم بے وقوف ہو تو تم عقلمندی برت رہے ہو اور اگر تم عقلمند ہو تو تم بے وقوفی سے کام لے رہے ہو۔

گلچیں

غزل

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے اُن کے بیٹھے ہیں اور قصّۂ فرقت کہتے ہیں

اب حسن و عشق میں فرق نہیں اب دونوں کی اِک حالت ہے
میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

اُن کی وہ حیا وہ خاموشی اپنی وہ محبت کی نظریں
وہ سننے کو سب کچھ سنتے ہیں ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

ہمدرد نہیں ہمراز نہیں کس سے کہئے کیونکر کہئے
جو دل پہ گزرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے سہتے ہیں

اِس شوقِ فراواں کی یارب آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
اِنکار کریں وہ یا وعدہ ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

آ دیکھ کہ ظالم فرقت میں کیا حال مرا بے حال ہؤا
آہوں سے شرارے جھڑتے ہیں آنکھوں سے دریا بہتے ہیں

اکبرؔ شاید دل کھو بیٹھے وہ جلسے وہ احباب نہیں
تنہا خاموش سے پھرتے ہیں ہر وقت اُداس سے رہتے ہیں

جلال الدین اکبر



نواہائے راز

تیرے دلِ مظلوم کی یہ دیکھ کے حالت — پھر ہے مری جاں اور وہی غم اور وہی کلفت

دیکھی تری افسردہ نگاہوں کی مصیبت — سُن لی تری افسوس کی آہوں کی حکایت

چھُپتا نہیں اب از گدازِ دل و جاں کا — کی دیدۂ غمناک نے مژگاں کو اشارت

سایۂ غمِ پنہاں کا پڑا تیری جبیں پر — کھُلنے لگی دُنیا پہ مرے کرب کی غایت

آخر ترے سینے سے یہ اک راہ نکل کر — تڑپی مرے دل میں تری مجبور محبّت

چھوڑا مجھے ہر اک نے مگر تو نے نہ چھوڑا — اک تیرے سوا ہی مجھے ہر اک سے شکایت

لُٹتا ہے مرے ضبطِ محبّت کا خزانہ — اے دیدۂ خونبار یہ ہی دوست کی دولت

اب گوشِ بقا میں ہی جس آوازِ حزیں نے — پھونکا تھا مرے کان میں افسونِ محبّت

مِٹ جائے گا سب کچھ مرے نغمے نہ مٹیں گے — اور زندہ رہے گا ترا افسانۂ اُلفت

جو دل ہے وہی داغ، جو سر ہے وہی سودا!

اپنی ہی سُنی، جس کی سُنی ہیں نے حکایت

حامد علی خاں

محفلِ ادب

پرتوِ خواب

سناٹا پچھلی رات کا ہے مخلوق خدا کی خواب میں ہے
تاروں کی نگاہیں نیچی ہیں ہلکی سی چمک مہتاب میں ہے

اطراف میں روشندانوں کے کچھ نور سا دھیما دھیما ہے
دیواروں کے نیچے گلیوں میں پرہول اندھیرا چھایا ہے

پتوں کو سمیٹے خواب میں ہیں دوڑی ہوئی بیلیں کاخوں پر
بول اٹھتا ہے بے ہنگام کبھی ایک آدھ پرندہ شاخوں پر

اللہ یہ کیسی بے چینی اس وقت دلِ بے تاب میں ہے
پرتو ہے یہ کس کا ذروں پر کس کی یہ جھلک مہتاب میں ہے

فردوس کی شمعیں روشن ہیں یا عکسِ چراغِ طور ہے یہ
گھر بھر میں یہ کس کا پرتو ہے ہر چیز پہ کیسا نور ہے یہ

حلقے میں گھرا ہوں جلووں کے ہستی کا نہیں کچھ ہوش مجھے
اس وقت یقیناً خواب میں کوئی دیکھ رہا ہے جوش مجھے

غربت میں ہے لطفِ صبحِ وطن ہر چیز پہ وہ رعنائی ہے
ویرانے میں اپنے مجنوں کی تسکین کو لیلیٰ آئی ہے

اک رنگ سا دل میں رقصاں ہے اک نور سا مجھ پہ چھایا ہے
ان ہونٹوں پہ شاید سوتے میں ہلکا سا تبسم آیا ہے!

نظام المشائخ

غزل گوئی پر تنگ دامانی کا الزام

ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل
پوچھئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

فارسی اور اردو کے غزل گو شاعروں نے خواجہ حافظ کے چشمۂ سرمدی سے فیض یاب ہو کر ان کے نقشِ قدم پر چلنے اور غزل میں ہر قسم کے خیالات اور جذبات ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو شخص تمثیل و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کی گفتگو سمجھنے سے قاصر ہے اسے غزل گوئی میں صرف گل و بلبل کی حکایت ملے گی لیکن جو لوگ بحرِ معنی کے غواص ہیں وہ قلزمِ غزل سے ہر قسم کے موتی رولتے ہیں۔ یہ غزل ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر صنفِ سخن کی کامیابی کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ حقیقت کو مجاز کے لباس میں جلوہ گر کیا جائے۔ موجودہ زمانے کے سب سے بڑے سحر بیان شاعر سر اقبال مئے حجازی کے لذت آشنا ہیں۔ ان کو حافظ شیرازی کی عجمی صہبا پسند نہیں۔ وہ فلسفی اور قومی شاعر کہلاتے ہیں لیکن کلام میں دلکشی و تاثیر پیدا کرنے اور شاہدِ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لئے وہ بھی حافظ شیرازی کا رنگین پیرایۂ بیان اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ وہ عشقیہ مضامین پر طبع آزمائی نہیں کرتے تاہم ان کا اندازِ تکلم عاشقانہ ہے۔ وہ قومی جذبات فلسفیات، حکیمانہ نکات، سیاسی معاملات وغیرہ کی ترجمانی کے لئے بھی وہی حسن و عشق کی زبان۔ وہی صنم پرستی کی اصطلاحیں وہی رندی و

سرمستی کی تمثیلیں۔ وہی قدما کی رنگین نوائی۔ وہی تشبیہ۔ وہی استعارے۔ وہی رنگ وہی راگ، وہی بحر استعمال کرتے ہیں جو عشقیہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یوں تو ان کے سارے کلام کا یہی انداز ہے۔ لیکن یہاں بطورِ نمونہ ان کی ایک پُرجوش و پرتاثیر نظم تصویر درد کا صرف ایک بند پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ شاعر کے خیال میں ہندوستان کی بدنصیبی، مفلسی اور غلامی کی ذمہ وار یہاں کی فرقہ آرائیاں اور انجمن سازیاں ہیں۔ فرقہ وارانہ منافشات شاعر کو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ وہ اہل ہند کو تمام تنازعات دور کر کے ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک ہو جانے اور آپس میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ خود ہی اتحاد و اخوت کا زبردست علمبردار بن کر آگے بڑھتا ہے اور اس مشکل مہم کو سر کرنے کا نہایت پرجوش الفاظ میں دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اگرچہ خطیبانہ ہے لیکن اس کا اندازِ تکلم بالکل عاشقانہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ؎

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا	لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے	تری ظلمت میں مَیں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا
مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا	چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں اِن بکھرے دانوں کو	جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں	کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے	تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

غزل گوئی پر تنگ دامانی کا الزام عاید کرنے والا سطح آشنا معترض تو کہے گا کہ ان اشعار میں دھرا ہی کیا ہے۔ زخمِ پنہاں کی نمائش۔ آنسو کے بدلے لہو رونا۔ محفل و گلستاں۔ شمع و چراغاں۔ غنچۂ دل۔ مشتِ خاک کی پریشانی۔ تسبیح کے دانے۔ سینہ کاوی کا شغل۔ داغِ محبت، آئینۂ حیراں یہ سب کے سب قدیم رسمی و متبذل فقرے ہیں۔ جو مدت سے ہر غزل گو شاعر کی زبان پر جاری چلے آ رہے ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ فی الحقیقت یہ منتر کے الفاظ ہیں۔ ان کی طلسمی قوت آن کی آن میں مجمع کو مسحور کر لیتی ہے۔ ان کی فسوں کاری معمولی سے معمولی مضمون کو نوک و نشتر بنا دیتی ہے۔

سطحی خیال کے آدمیوں کو غزل کے اسلوبِ بیان سے اکثر دھوکا ہوتا ہے۔ وہ صرف الفاظ کو دیکھتے ہیں اور ان کے ظاہرا معنی سے نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ غزل میں صرف حسن و عشق کے معاملات بیان ہوتے ہیں اس لئے اس کا دامن نہایت تنگ و محدود ہے۔ اگر وہ تمثیل و کنایہ کا پردہ چاک کر کے اشعار کے بطن و ماہیت پر نظر کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ "این خانہ تمام آفتاب است"۔ حیاتِ انسانی کا وہ کون سا فلسفہ ہے، معاملاتِ زندگی کا وہ کون سا پہلو ہے۔ رموزِ ہستی کا وہ کون سا نکتہ ہے جس پر غزل گو شعرا نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ تشبیہ و استعارہ کے پسِ پردہ جو گنجینۂ معنی پوشیدہ ہے وہاں تک اگر کسی سطح بین معترض کی ذہنی رسائی نہ ہو تو اس میں شاعر کا کیا قصور ہے؟

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

(جہانگیر)

بال کا پھندا

(مندرجۂ ذیل افسانہ اگر رات بھر کھلے آسمان کے نیچے شبنم میں بھیگنے کے لئے رکھ دیا جائے تو صبح تک پھول کر ڈیڑھ سو صفحے کے ناول کا حجم پیدا کرے گا)

مُعمّا تقریباً لاینحل تھا۔ نمبر ایک، نوجوان کو بلاشبہ قتل کیا گیا تھا۔ نمبر دو، قاتل ایک مردِ نامعلوم تھا۔

اِس لئے مشہور ترین "سُراغرساں" کو بلانے کی ضرورت پیش آئی۔

اس نے لاش پر ایک سرسری نظر ڈالی، اور دفعتہً جیب سے خوردبین نکالی۔

"ہا، ہا۔" اس نے مقتول کے کوٹ کے کالر سے ایک بال اٹھاتے ہوئے کہا۔ "معما اب حل ہو گیا۔"

اُس نے بال کو دو انگلیوں میں احتیاط سے پکڑ کر سب کو دکھایا۔

"سنو۔" اس نے کہا۔ "بال کے مالک کی تلاش کرو۔ وہی قاتل ہے"۔

منطق صحیح اور استدلال قاطع تھا۔

سراغرساں نے تلاش شروع کی۔

چار دن اور چار راتیں وہ بھیس بدلے شہر کی گلیوں میں گھومتا رہا، ہر رہرو کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے جس کے سر کا کوئی بال کم ہو۔

پانچویں دن اُس نے ایک آدمی کا پتا لگایا جو سیّاح کے لباس میں تھا۔ جہازی ٹوپی اوڑھے ہوئے جو سر کو کانوں تک چھپاتے ہوئے تھی یہ شخص جہاز پر سوار ہو رہا تھا۔

سراغرساں اس کے ساتھ ہی تختۂ جہاز پر چڑھ گیا۔

"گرفتار کر لو۔" اُس نے کہا اور پھر اپنے سینے کو اُبھار کر، بال کو دو اُنگلیوں میں احتیاط سے پکڑ کر مسافروں کو دکھانے لگا۔

"ٹوپی اتارو" جہاز کے کپتان نے درشتی سے کہا۔

اُس نے تعمیل کی۔

اس کا سر انڈے کی طرح گنجا تھا۔

"ہا" مشہور ترین سُراغرسان نے بغیر ایک لمحہ کے تامل کے کہا۔ "تو پھر اس نے ایک نہیں ہزاروں ہی قتل کئے ہیں (لیکاک)

(ساقی)

تصاویر

بھولے ہوئے افسانے۔ یہ مشہور مصور البرٹ مور (۱۸۹۳-۱۸۴۱) کی ایک بہترین تصویر ہے تخلیق حسن اس مصور کی خصوصیت ہے اس کی تصویروں کی جزئیات تک میں خوبصورتی کا اہتمام ہوتا تھا چنانچہ اس تصویر میں خوبصورت عورتوں کے کپڑوں کے علاوہ دوسری سب چیزوں کی آرائش بھی پھولوں اور بیلوں کے ساتھ نہایت کاوش سے کی گئی ہے اور تمام تصویر از سرتاپا حسن کا ایک مرقع معلوم ہوتی ہے۔

فیضانِ عشق۔ یہ فرانسیسی مصور بسن کے انوکھے تصور کا نمونہ ہے۔ ایک لڑکی ٹوکرے میں کیوپڈ ڈالے بیچ رہی ہے۔ گویا حسن اہلِ دل کو عشق کی صلا دے رہا ہے۔

جنگل کی شہزادی۔ اس تصویر کا قصہ تقریباً ہر زبان میں موجود ہے شہزادی شادی کے بعد پہلی دفعہ اپنے شوہر کے ملک کی طرف جا رہی تھی راستہ میں چالاک کنیز نے بھولی شہزادی کے کپڑے اتار کر خود پہن لئے اور اپنے اسے پہنا کر دھوکے سے ملکہ بن گئی بیچاری شہزادی بطخوں کی رکھوالی بنادی گئی شہزادی کے چہرے سے مصور نے اس کا اندرونی درد و کرب نہایت قابلیت سے دکھایا ہے۔

حیاتِ ثانی۔ انگریز مصور سر ایڈون لینڈ سیر (۱۸۷۳-۱۸۰۳) کی فن کاری کا نتیجہ ہے۔ جانوروں اور بالخصوص کتوں کی تصویر بنانے میں اس مصور کا کوئی ثانی نہیں۔ سر والٹر سکاٹ جیسا "کتوں کا دوست" اس کے کتوں کا مداح تھا تصویر میں ایک نفیس کتا بچے کی جان بچا کر اسے اٹھائے ہوئے سمندر سے نکلا ہے۔ سامنے چٹان ہے جس پر بوجھ اٹھا کر چڑھنا اس کے لئے دشوار ہے۔ شریف کتا مدد کے لئے بھونک رہا ہے۔

خزاں۔ اس تصویر میں خزاں کا حسن اپنی پوری جاذبیت کے ساتھ نمایاں ہے۔

دو بہنیں۔ یہ عہدِ حاضر کی ایک لاجواب تصویر ہے۔ معصومیت اور محبت کی فضا پر میٹھی نیند کا طلسم چھا رہا ہے۔

افسانے کا انجام۔ محبت کے دل خوش کن خوابوں کے بعد آخر دونوں میں ان بن ہو گئی ہے۔

رفتار۔ یہ تصویر بلاشبہ رفتار کی مظہر اتم ہے۔ سرعت اپنی پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔

آئینہ جوئبار۔ حسین گوالن کا شوقِ خود پسندی اپنے گلے کا خیال چھوڑ کر پانی کے آئینے میں اپنا جلوہ دیکھ رہا ہے۔

تاش کی بازی۔ یہ ایک مشہور مغربی مصور کی کامیاب تصویر ہے یہ چاروں چھوٹی تصویریں ماہرِ فن فرانسیسی نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

تبصرہ

ارتقا - یہ انجمن ترقی اُردو کی کتاب ہے اور حسبِ معمول بہ حُسنِ اہتمام نفیس سُنہری جلد کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے زبان کی جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ارتقا کے موضوع پر جہاں تک ہمارا خیال ہے اردو میں اس سے قبل کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی اور یہ مشتاق احمد صاحب وجدی کا اردو دنیا پر احسان ہے کہ پہلے پہل اُن کی ہمت سے یہ کام سرانجام ہُوا۔ ہر اردو دان صاحبِ ذوق کے پاس یہ کتاب ضرور ہونی چاہیے۔ حجم ۵۰۱ صفحات۔ قیمت مجلد عمر۔ غیر مجلد عہ۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے +

غلبۂ رُوم - یہ کتاب مولانا ظفر علی خاں نے منٹگمری جیل کے زمانۂ اسیری میں لکھی تھی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور نے اپنے اہتمام میں طبع کرا کے شائع کی ہے۔ سورۂ روم کی ابتدائی آیات میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے مولانا نے "تاریخ ایران و روما" کی روشنی میں اس کی تصدیق کی ہے۔ زبان اچھی ہے اور اندازِ بیان پُر زور۔ فی الحقیقت بعض لطیف نکتے پیدا کیے گئے ہیں۔ قیمت عا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور سے منگوا لیجئے +

دیوانِ گرامی - ملک الشعرا مولانا غلام قادر گرامی مرحوم موجودہ ہندوستان میں فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کے بعد فارسی زبان پر اتنی قدرت رکھنے والا دوسرا نظر نہیں آتا۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب نے یہ بہت بڑا کام کیا ہے کہ مرحوم کا منتشر کلام یکجا کر کے ۲۱۴ صفحے کے اس دیوان کی صورت میں شائع کر دیا۔ کتاب مشہور خوشنویس عبد المجید پرویں رقم نے لکھی ہے اور طباعت قابلِ تعریف ہے۔ چکنا کاغذ لگایا گیا ہے۔ امید ہے کہ شائقین اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیں گے۔ قیمت عمر۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری منڈی لاہور سے طلب فرمائیے +

نیرنگِ خیال کا اقبال نمبر - ستمبر و اکتوبر کے پرچوں کے بجائے نیرنگ خیال کا یہ چار سو سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا شاندار نمبر خوبصورت کتابی سائز میں شائع ہُوا۔ اقبال نمبر ظاہری و معنوی اعتبار سے یکساں قابلِ صد تحسین ہے۔ اقبال کی تازہ تصویروں کے علاوہ اس میں دیگر مشاہیر کی بھی بہت سی تصاویر ہیں۔ سرورق حسن و سادگی کا مرقع ہے۔ مضامین میں اقبال کی زندگی اور اقبال کے فلسفے پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بیشتر مضامین اقبال کے متعلق معلومات کا گنجینہ ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حکیم یوسف حسن صاحب نے پنجاب اور بیرونِ پنجاب کے تقریباً تمام مشہور ادبا سے بہت محنت کے ساتھ مضامین حاصل کیے ہیں اور اس نمبر کو اس قابل بنا دیا ہے کہ یہ ایک بیش قیمت کتاب کے طور پر ہر صاحبِ ذوق کے کتب خانے کی زینت بن سکے۔ قیمت دو روپے۔ پتا:- دفتر "نیرنگ خیال" لاہور

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ سے شائع کیا

صرف سرورق اور تصاویر وکٹوریا آرٹ پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپیں